سلسلہ نمبر۔ ۲۵

شکیلہ اختر

پروفیسر قمر جہاں

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

شکیلہ اختر

پروفیسر قمر جہاں

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔ ۲۵

Shakeela Akhtar

By

Prof. Quamar Jahan

❁ نام کتاب	:	شکیلہ اختر
❁ مصنف	:	پروفیسر قمر جہاں
❁ سال اشاعت	:	2023ء
❁ کل صفحات	:	121
❁ کمپوزنگ وتزئین	:	ڈاکٹر خالدہ ناز
❁ سرورق	:	روائل کمپیوٹر، پٹنہ
❁ طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔ ۶

ملنے کا پتہ

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

٭

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعر و ادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمال فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضل حق آزاد، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعر و ادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں تیئس (۲۳) مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقف عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمز عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ، ۱۱۔ غیاث احمد گدی، ۱۲۔ جمیل مظہری، ۱۳۔ انجم مانپوری، ۱۴۔ بیتاب صدیقی، ۱۵۔ عبدالغفور شہباز، ۱۶۔ فضل حق آزاد، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ کلام حیدری، ۱۹۔ اویس احمد دوراں، ۲۰۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۱۔ امداد امام اثرؔ، ۲۲۔ احمد یوسف، ۲۳۔ صدیق مجیبی کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا۔

شکیلہ اختر

شکیلہ اختر اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ وہ خواتین افسانہ نگاروں میں کامیاب اور اعلیٰ درجے کی کہانی کار تسلیم کی جاتی ہیں۔ شکیلہ اختر کو بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ خواتین قلم کاروں نے افسانہ نگاری میں اپنے فنی جوہر دکھائے اور مزید کئی خواتین فنکار افسانہ نگاری میں اپنا جوہر دکھا رہی ہیں۔ شکیلہ اختر کے ذکر کے بغیر نہ صرف خواتین افسانہ نگاروں بلکہ بحیثیت مجموعی اردو افسانہ نگاری کا جائزہ مکمل نہیں ہوگا۔ شکیلہ اختر کی کہانیوں میں روایتی انداز قائم ہے۔ ان کے افسانوں میں موقع کی مناسبت سے اشعار کا انتخاب افسانے کی خوبصورتی اور دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانے سماجی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ اردو افسانہ نگاری کے لئے شکیلہ اختر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

اس فردنامہ کی مصنفہ پروفیسر قمر جہاں، افسانہ نگار، تنقید نگار اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ریاست بہار کے میٹرک کے اردو نصاب میں شامل کل چار افسانوں میں ان کا ایک افسانہ ''کٹی ہوئی شاخ'' بھی شامل نصاب ہے جو بہت ہی مقبول افسانہ ہے۔ ان کی نگارشات ملک کے مؤقر و مشہور ماہناموں، رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ شکیلہ اختر پر پروفیسر قمر جہاں کے کئی مضامین مشہور اخبار و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا شکیلہ اختر پر لکھا ہوا یہ فردنامہ ایک اہم تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیشکش قارئین کو پسند آئے گی۔

احمد محمود

ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

ہمارے استادِ محترم پروفیسر کلیم عاجز صاحب نے فرمایا: ؎

فن میں نہ معجزہ، نہ کرامات چاہئے
دل کو لگے بس، ایسی کوئی بات چاہئے

واقعی تخلیقی ادب میں دل کو لگنے والی بات ہی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے --انگریزی زبان کا لفظ ''مونوگراف'' جس کا اردو ترجمہ ''فرد نامہ'' ہے۔ صحیح معنی میں ایک آسان نثری صنف ہے۔ لیکن کبھی کبھی بعض بے حد آسان کام، اس قدر دشوار ہو جاتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہیں:۔''مونوگراف'' تنقید نہیں ہے، نہ خودنوشت ہے، نہ سوانح نگاری اور نہ خاکہ نویسی بلکہ لغت میں اس لفظ کے معنی ہیں کسی ایک ہی موضوع پر طویل مضمون لکھنا یعنی کسی فردِ خاص کے فن اور شخصیت کا مختصر مگر جامع تعارف۔

محترمہ شکیلہ اختر اور بہار کے نسائی ادب پر میرے کئی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ---جیسے ماہنامہ 'زبان و ادب' پٹنہ میں ''شکیلہ اختر: کچھ یادیں، کچھ باتیں'' (جلد ۲۱، شمارہ ۲، مارچ/اپریل ۱۹۹۵ء)''بہار کا نسائی ادب'' خاصا طویل مضمون ہے اشاعت'' بھاشا سنگم پٹنہ'' (جولائی۔ دسمبر ۲۰۱۸ء)، مژگاں کلکتہ کے خاص نمبر میں بعنوان'' بہار کی خواتین افسانہ نگار: آغاز تا حال (۲۰۱۷)، راج بھاشا کے'' بھاشا سنگم'' میں ہی'' شکیلہ اختر: شخصیت وفن اور شکیلہ اختر کے نسائی کردار'' (سیمینار) وغیرہ میں اتنے زیادہ مواد جمع ہو چکے ہیں کہ جب مجھے اردو ڈائرکٹوریٹ سے شکیلہ اختر پر مونوگراف لکھنے کے لئے معاہدہ نامہ ملا تو میں نے سوچا کہ اسے تو ترتیب دینا ایک دم آسان کام ہے اور واقعی آسان تھا، مگر بُرا ہو اس کرونا مہاماری کا کہ جس نے ہمارے ایک سے ایک ہونہار اور مستند ادبی ہستیوں کو منٹوں میں زمین کی غذا بنا دیا اور ہم ماتم کرتے رہ گئے۔ ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے ؟

اچانک لاک ڈاؤن، گھر میں خاوند کی علالت---غرض میں خود یاسیت کی شکار ہوگئی تھی۔ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ایک طویل عرصے تقریباً سال ڈیڑھ سال تک میرا قیام رانچی میں اپنے صاحبزادے (حسن پرویز) کے پاس رہا، جہاں میں اپنی ذاتی لائبریری بھاگل پور سے دور بہت دور ہوگئی تھی، لاک ڈاؤن میں ایسا ماحول تھا کہ گھر سے باہر نکلنا بھی ممکن نہیں تھا---شاعری، افسانہ اور ناول کے علاوہ کچھ بھی لکھنے کے لئے مطالعہ ضروری ہے،اور پڑھنے لکھنے کے لئے ذہنی یکسوئی ضروری شرط ہے، ذہنی انتشار اور اضطراب کے اس دور میں ، وہ بھی اس عمر میں اب ذہنی یکسوئی تو خیر ممکن نہیں ہے۔غنیمت ہے کہ'' مونو گراف'' آپ لوگوں کی عنایت کی ایک نظر سے مکمل ہوگیا ہے، کام کیسا ہوا ہے، یہ تو ہمارے قارئین ہی بتا سکتے ہیں؟--اب دیکھئے آگے کے مراحل کیسے حل ہوتے ہیں؟---بہرکیف! کسی بھی کام کے کامیاب ہونے میں کئی لوگوں کا تعاون شامل رہتا ہے۔

سب سے پہلے میں ان سنہرے دنوں کو یاد کرتی ہوں جب بہار میں اردو پر واقعی بہار آگئی تھی، قومی کونسل دہلی، حکومتِ بہار کا محکمہ راج بھاشا پٹنہ، اور بہار اردو اکاڈمی پٹنہ نے ایک ایسا خوشگوار ماحول بنا دیا تھا کہ آئے دن قومی، عالمی سیمینار اور جشنِ اردو وغیرہ بڑے تزک واحتشام سے منائے جارہے تھے۔ قومی کونسل دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم ، راج بھاشا اردو کے ڈائریکٹر امتیاز احمد کریمی، صدر شفیع مشہدی، مشتاق احمد نوری (سابق سکریٹری بہار اردو اکاڈمی) ڈاکٹر اسلم جاوداں (نائب مدیر بھاشا سنگم) وغیرہ کی انتھک محنت اور سعیِ مستحسن سے اردو دنیا واقعی حرکت میں آگئی تھی اور حرکت میں برکت کا جلوہ دیکھنے کو مل رہا تھا۔خواتین ادب کو بھی اس دور میں خصوصی اہمیت دی گئی تھی۔قومی اور عالمی پیمانے پر خواتین کے سیمینار برابر منعقد ہورہے تھے۔

قابلِ تعریف بات یہ ہوئی کہ اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ نے بہار کے بہت سارے ادباء وشعراء، تنقید نگار ، افسانہ نگار، صحافی اور ادب دوست حضرات کی تلاش وجستجو کے بعد انہیں منظرِ عام پر لایا۔ ''بھاشا سنگم'' اردو کا ایک دیدہ زیب اور بیش بہا رسالہ بن گیا ہے۔اس رسالہ کے کئی خاص نمبر آئے جو دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔اردو کے ادبی سرمائے کے تحفظ اور فروغ کے لئے کئی مثبت اقدام بھی کئے گئے ہیں۔اس ضمن میں مشاہیرِ ادب کی خدمات کے اعتراف اور نئی نسل سے انہیں واقف کرانے کے لئے

ان پر یادگاری خطبہ اور مونو گراف لکھوانے کا کام بھی ہو رہا ہے۔۔۔میرا پیش نظر کام بھی اسی نوعیت کا ہے۔
پہلی فہرست میں خواتین میں شکیلہ اختر اور رشیدۃ النسا، کا انتخاب ہوا ہے۔

میری نااہلی اور وقت و حالات کی ستم ظریفی تھی کہ میں اپنی شدید خواہش کے باوجود کافی تاخیر سے یہ کام کر رہی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ پہلے لاٹ میں نہیں مگر کچھ وقت لے کر یہ کام مکمل ہو گیا ہے۔ موجودہ ڈائریکٹر جناب احمد محمودی کی میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے وقت دے کر مجھ پر خصوصی کرم کیا ہے۔ اچھا کام کرنے والوں کا مزاج صلہ اور ستائش کی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ وہ کام کو اپنی ذمے داری سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بہت سارے بہتر کام کرنے والے لوگ مثبت اور تعمیری فکر رکھتے ہیں اور ایسے ہی لوگ زندگی میں کامیاب اور کامران ہیں۔ اس لئے میں دیگر اراکین کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان سبھوں کی کرم فرمائی میرے لئے باعث افتخار و انبساط ہے۔

میں خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ میرے عزیز شاگردان ڈاکٹر خالدہ نازان کے خاوند ڈاکٹر محمد صدیق اور ڈاکٹر ارشد رضا (مدیر اندیشہ) نے ہمارے کام کو مکمل شکل میں لانے کے لئے اپنی مصروفیات کے باوجود کسی نہ کسی طور پر ہماری مدد کی۔ بلکہ خالدہ ناز نے تو کمپوزنگ کے اہم فرائض انجام دیے ہیں۔ ان تمام کو میں اپنی دعاؤں میں شامل کرتی ہوں۔ بے حد شرمندہ ہوں کہ خلاف توقع میں وقت پر مسودہ جمع کرنے سے قاصر رہی۔ انتہائی معذرت اور نیک خواہشات کے ساتھ۔ بقول شاعر

گزر جائیں گے جب دن، گزرے عالم یاد آئیں گے
ہمیں تم یاد آؤ گے، تمہیں ہم یاد آئیں گے

پروفیسر قمر جہاں

شکیلہ اختر: ایک نظر میں

(معروضی)

نام:

شکیلہ توحید

قلمی نام:

شکیلہ اختر

والدہ کا نام:

صالحہ خاتون

والد کا نام:

شاہ محمد توحید

دادا کا نام:

شاہ عمر

نانا کا نام:

سید ارادت حسین

تاریخ پیدائش:

۱۶/اگست ۱۹۱۶ء

جائے پیدائش:

ارول، ضلع گیا (بہار) نیا ضلع جہان آباد

ننھیال:

ارول، ضلع گیا (بہار) نیا ضلع جہان آباد

دادھیال:

ارول، ضلع گیا (بہار) نیا ضلع جہان آباد

ابتدائی تعلیم:

گھر میں، یعنی اسکول اور کالج کی سند نہیں تھی مگر گھر کا ماحول علمی وادبی تھا ،والدین کو بھی علم وادب کا خصوصی ذوق تھا اس لئے شکیلہ اختر کی صلاحیت بہت اچھی تھی۔

استاد کا نام:

جناب عبدالغفور، ۹ سال کی عمر میں پردے میں گھر میں بیٹھا دی گئیں تھیں لیکن مطالعہ کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ بعد میں اختر صاحب کی صحبت نے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔

مشغلے:

افسانہ نگاری، شاعری، باغبانی، گھر کی آرائش وزیبائش، مہمان نوازی وغیرہ۔

شادی:

۲۴ رمئی ۱۹۳۲ء میں انتہائی سادگی کے ساتھ ہوئی تھی۔

خاوند کا نام:

اختر احمد، اورین، ضلع مونگیر، بہار۔

خاوند کا قلمی نام:

اختر اورینوی، صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی، اردو ادب کی نامور ادبی ہستی۔

رہائش گاہ:

(شادی کے بعد) چھجو باغ، نزد گول گھر، پٹنہ۔

اولاد:

لاولد، مگر گھر ہمیشہ بھائی بہنوں کی اولاد سے بھرا رہا، ان میں بیشتر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے پٹنہ آتے تھے۔

بھائی کا نام:

ڈاکٹر آفتاب (کناڈا میں سرجن تھے)۔

بہن:

(۲) دو رضیہ رعناء (اپنے وقت کی مشہور شاعرہ) دوسری بہن صوفیہ فضل جو اختر اور رینوی صاحب کے چھوٹے بھائی فضل احمد (ڈی۔ آئی۔ جی) کی اہلیہ تھیں ۔دوسگی بہنوں کے علاوہ رشتے کی انگنت بہنیں ایک ساتھ ہی رہتی تھیں ۔نسیمہ سوز چچازاد بہن تھیں جو افسانہ نگار تھیں ۔دوسری چچازاد بہن زہرہ نگار شاعرہ تھیں ۔والدہ صالحہ خاتون نے گھر میں ہی ''فردوسِ خیال'' نام سے ایک ذاتی کتب خانہ قائم کیا تھا۔اس وقت کے مشہور ادبی رسائل وہاں ہر ماہ آتے تھے ۔وہ خود بھی مطالعہ کرتی تھیں اور بچوں میں بھی کتب بینی کا ذوق جگایا تھا۔

بقول صوفیہ فضل:

''انہیں (شکیلہ اختر کو) بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا اور رسالے میں چھپنے کا بہت شوق تھا۔دس سال کی عمر میں شاعری شروع کردی تھی۔''

[سہیل۔گیا ،اختر اور رینوی نمبر]

افسانے کی اشاعت کے بعد مدیر محترم محمد طفیل صاحب کے مشورے سے افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوگئیں۔اور اس صنف میں ایسا کمال دکھایا کہ ارتقاء کی منزلیں آسان ہوگئیں۔

ایک لمبے عرصے تک اردو افسانے میں پریم چند کا ''کفن'' جدید نسل کے لئے ایک خوبصورت افسانوی نمونہ بنا رہا۔اسی طرح شکیلہ اختر کے افسانے ''ڈائن'' اور ''آنکھ مچولی'' بہار کی جدید نسل کے لئے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلا شائع شدہ افسانہ:

بعض ناقدوں نے ''مدرس'' کو ان کا پہلا شائع شدہ افسانہ قرار دیا ہے لیکن بعد کی تحقیق نے متفقہ طور پر ''رحمت'' کو پہلا افسانہ قرار دیا ہے جس کا سالِ اشاعت ۱۹۳۶ء رسالہ ''ادبِ لطیف'' لاہور ہے۔گویا ۱۹۳۶ء سے ۱۹۸۶ء تک موصوفہ کا ایک طویل ادبی و تخلیقی سفر رہا ہے اور

بلاشبہ وہ بہار کی ایک مایۂ ناز افسانہ نگار ہیں۔

تاریخ وفات:

۹ فروری ۱۹۹۴ء پٹنہ، شری کرشنا پوری فلیٹ میں۔

تدفین:

۱۰ فروری ۱۹۹۴ء، قادیان پنجاب، اختر اورینوی صاحب کے قریب مدفون ہیں۔

مسلک:

قادیانیت (قادیانی)۔

محترمہ شکیلہ اختر کی تصانیف:

	تصانیف	سال اشاعت	مقام اشاعت
۱:	درپن	۱۹۳۷ء	(افسانوی مجموعہ) مکتبہ اردو لاہور
۲:	آنکھ مچولی	۱۹۴۰ء	(افسانوی مجموعہ) بمبئی، قادری پریس، نور منزل، محمد علی روڈ
۳:	ڈائن	۱۹۵۲ء	مکتبہ اردو، رمنہ روڈ، پٹنہ
۴:	آگ اور پتھر	۱۹۶۷ء	رام نرائن بینی پرساد، الہ آباد
۵:	لہو کے مول	۱۹۷۶ء	بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ ۴
۶:	آخری سلام	۱۹۸۶ء	ناشر مصنفہ، نامی پریس، لکھنو
۷:	تنکے کا سہارا	۱۹۷۵ء	(ناولٹ) نصرت پبلیشرز، لکھنو

(یہ ناولٹ تین طویل افسانوں پر مشتمل ہے۔ ''تنکے کا سہارا''، ''سرحدیں''، ''منزل'')

ترتیب وتدوین:

۱: مطالعہ، مومن

۲: ''گزارش'' (اختر اورینوی کے صحافتی مضامین کا مجموعہ)

۳: ''خاکے'' (سہیل عظیم آبادی، محمد طفیل، رپوتاژ بعنوان ''خوش آمدید'' ساغرِ نو، اختر اورینوی نمبر میں)

۴: بہار کے لوک گیت اور بچوں کے ادب پر بھی چند مضامین ہیں۔

۵: چند افسانوی مجموعے پر تقریظ بھی لکھے گئے ہیں (شمیم صادقہ، اعجاز شاہین کے افسانوی مجموعے پر)

۶: ''موج اور ساحل'' نامکمل ناول

دیگر علمی و ادبی خدمات:

۱: مدرسہ قائم کر کے نادار غریب بچے اور بچیوں کی مفت تعلیم کا انتظام۔

۲: بہار اردو اکادمی پٹنہ کی مجلسِ عاملہ کی رکن (ممبر)

۳: خدابخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری کی لائف ٹائم ممبر شپ

۴: ریڈیو اسٹیشن پٹنہ کی مشاورتی کمیٹی (ایڈوائزری کمیٹی) کی رکن

۵: مختلف سیمیناروں میں شرکت

۶: بیرونِ ملک سفر:- کنیڈا، پاکستان

۷: اندرون ملک:- مختلف شہروں کا سفر، قادیان، دہلی، ممبئی، جمشید پور، رانچی بھاگل پور وغیرہ

انعامات و اعزازات:

۱: بہار اردو اکادمی پٹنہ کا پہلا انعام اردو کی مجموعی خدمات کے لئے۔

۲: ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' کے لئے یو پی اردو اکادمی سے انعام۔

۳: ۱۹۸۲ء سے تا زندگی سابق گورنر بہار جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی نے ۴۰۰ روپے ماہوار رائٹر وظیفہ جاری کیا تھا جو تا زندگی انہیں ملتا رہا۔

۴: بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہونے کا شرف انہیں متفقہ طور پر حاصل ہے۔

۵: افسانہ ''ڈائن'' ''آنکھ مچولی'' اور ''کیڑے'' وغیرہ نصاب میں بھی شامل ہیں۔

❋

شکیلہ اختر۔ شخصی تعارف

اک پیکرِ اخلاص و وفا دیکھ رہے ہیں
آئینہ ہے حیراں کہ کیا دیکھ رہے ہیں
(علیم اللہ حالی)

شکیلہ اختر جن کا اصل خاندانی نام شکیلہ توحید تھا، اختر اورینوی صاحب کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد شکیلہ اختر کہلانے لگیں اور پھر اسی نام سے قلمی دنیا میں مشہور و معروف ہوئیں محترمہ شکیلہ اختر بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہونے کا شرف رکھتی ہیں۔ ان کے والد کا نام شاہ محمد توحید اور والدہ کا نام صالحہ خاتون ہے۔ تاریخ ولادت کے سلسلے میں کئی اقوال تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق محترمہ کی تاریخ ولادت ۱۶راگست ۱۹۱۶ء ہے۔ جائے ولادت ارول موجودہ ضلع جہان آباد ہے۔ انتقال ۷۷ سال کی عمر میں ۱۰فروری ۱۹۹۴ء کو پٹنہ شہر میں ہوا۔ مدفون قادیان (پنجاب) میں ہوئیں، اختر اورینوی صاحب کے پہلو میں جگہ ملی ہے۔

شادی ۲۴مئی ۱۹۳۳ء میں انتہائی سادگی سے ہوئی تھی، یہ دونوں فریقین کی پسند کی شادی تھی، اختر اورینوی صاحب رشتے میں شکیلہ اختر کی والدہ کے چچازاد بھائی تھے۔ شادی کے فوراً بعد وہ اختر اورینوی صاحب کے ہمراہ پٹنہ آگئی تھیں۔ اس وقت اختر صاحب باضابطہ برسر روزگار نہیں تھے۔ شادی کا ابتدائی زمانہ شکیلہ اختر کے لئے سخت آزمائش اور صبر آزما تھا۔ معاشی تنگی کے ساتھ اختر صاحب کی طویل علالت نے انہیں اندر سے احساس محرومی کا شکار بنا دیا تھا۔ بقول شاعر اختر کاظمی ۔

طویل ہے غم کی دھوپ لوگو، نشاط کی چھاؤں مختصر ہے
گزارتا ہے اسے وہ کیسے، سمجھ پہ انساں کے منحصر ہے

پٹنہ آنے کے بعد شروع میں کرایے کے مختلف مکانوں میں رہنے کے بعد چھجو باغ کوارٹر نمبر ۵، بعد میں کوارٹر نمبر ۸ ہریجن کالونی میں ایک طویل عرصے تک قیام پزیر رہیں، عمر کے آخری ایام میں شری کرشنا

پوری فلیٹ میں منتقل ہوئیں اور اسی فلیٹ میں آخری سانس لی۔ پنچو باغ کوارٹر نمبر ۸ میں میری پہلی ملاقات موصوفہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد آرہا ہے ۱۹۷۰ء دسمبر کا مہینہ تھا (میں اپنے خاوند کے ساتھ دس گیارہ بجے کے قریب پہنچی تھی، مجھے اختر صاحب سے سرٹیفکٹ پر دستخط کرانے کی ضرورت تھی) شکیلہ اختر صاحبہ اندر کے برآمدے میں دہلیز کے پاس موسم سرما کی گلابی دھوپ میں کرسی پر دراز تھیں، ان کی نظر کے سامنے اندر کمرے میں اختر صاحب بستر علالت پر نہایت تکلیف کی حالت میں تھے، اس وقت وہ پارکزم (Parkinsonism) کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ نرس ان کی خدمت میں تھی --- گھر کا ماحول انتہائی صاف ستھرا غضب کا پرسکون، لیکن یاسیت سے لبریز تھا۔

شکیلہ اختر ملازمت پیشہ خاتون نہیں تھیں اور نہ تو کسی اسکول یا کالج کی سند ان کے پاس تھی، مگر وہ ایکدم سے گھریلو عورت بھی نہیں تھیں، بلکہ ایک باشعور اور باوقار خاتون تھیں۔ پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو اختر اورینوی صاحب کی اہلیہ ہونے کی وجہ سے محترمہ کا سماجی حلقہ خاصا وقیع اور وسیع تھا، اختر صاحب کے شاگرد ان انہیں 'آپا' کہا کرتے تھے۔ (ایک طرح سے وہ Universal یونیورسل آپا تھیں) اور سبھی لوگ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے --- وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت نہیں لیکن بدصورت بھی نہیں تھیں، گندمی رنگ، بڑی بڑی چمکدار خوبصورت آنکھیں، گداز جسم، مغربی وضع کے ترشے ہوئے سیاہ گھونگھریالے بال، اوسط قد، مہذب اندازِ گفتگو، رعونت سے لبریز پُرکشش شخصیت، لباس اور وضع قطع میں نفاست اور سادگی --- اپنے ملنے والے کو وہ مرعوب نہیں متاثر کر لیتی تھیں، اختر اورینوی صاحب طویل قامت، تیکھے نقوش، سرخ وسفید رنگ، ریشمی گفتگو اور خوبصورت شخصیت اور بے حد نفیس مزاج کے حامل تھے۔ موصوف کی اس نفاست اور رکھ رکھاؤ میں خود شکیلہ اختر کا اہم کردار رہا ہے۔ اپنی ایک تحریر میں وہ رقمطراز ہیں:-

> ''.........اختر صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بڑے لوگوں کو اپنی چیزوں کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ ان کی نگاہیں بلندیوں اور گہرائیوں پر ہوتی ہیں، ان چھوٹی چھوٹی سطحی باتوں کو نہیں دیکھتیں.........تو شاید یہی بلند نظری تھی جب ہی تو اختر صاحب کافی اونچی اُڑان پر رہتے ہیں، قمیض کے کولر اور کف پر کبھی کبھی چکٹ بھی جم جاتی ہے اور ہفتوں بغیر پولش کے جوتے پیاسے پڑے رہتے ہیں جب دیکھو الٹا

ہوکر پینے چپے آرہے ہیں اور موزہ تو ابھی آج تک اختر صاحب نے سیدھا پہنا ہی

نہیں ۔۔۔۔۔ یہ پتیوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، ان کی طرف دھیان دینے کی

بیچارے کو فرصت ہی کہاں تھی ؟!''

(بحوالہ مضمون ''خوش آمدید'' از شکیلہ اختر، ساغر نو، صفحہ ۹۴ تا ۹۵)

اس رپورتاژ نما طویل مقالے میں اختر اورینوی صاحب کے ساتھ ساتھ خود شکیلہ اختر کی سیرت بھی جھلک رہی ہے۔ محترمہ کا سلیقہ، ان کی ہنر مندی کے ساتھ ساتھ اپنے شریک حیات کے ساتھ ان کا بے پناہ لگاؤ اور بھرپور تعاون کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ خود مصنفہ کے الفاظ میں:-

''وہ بڑے سکون اور بے فکری کا زمانہ تھا، کم پیسوں میں بھی شرافت کا بھرم رہ جاتا تھا--- دو تین چھوٹی بڑی دریاں ایک کوٹھری میں بچھائیں، بکس میں سے ایک دو صاف اور بستر کے اندر سے کچھ دلی ملی سی چادریں نکالیں اور سیٹ کر ان کو جوڑی ہوئی دریوں پر بچھا دیا، آس پاس کے کوارٹروں میں خبر ہو ہی چکی تھی کہ اردو کا ایک بڑا شاعر (ساغر نظامی) اس چھوٹے سے گھر میں آرہا ہے۔''

(بحوالہ مضمون 'خوش آمدید' از شکیلہ اختر، ساغر نو، صفحہ ۸۱)

اسی مقالہ سے یہ علم بھی ہوتا ہے کہ:-

''اختر صاحب کو ۱۹۳۸ء دسمبر میں پٹنہ کالج میں لکچرر شپ ملی تھی اور ایسی اچانک ملی تھی جیسے خدا نے بیٹھے بیٹھائے چھپر پھاڑ کر یہ ملازمت انہیں دے دی ہو۔''

(بحوالہ مضمون 'خوش آمدید' از شکیلہ اختر، ساغر نو، صفحہ ۸۱)

اس زمانے کے اکثر نامور شاعر و ادیب، ناقد و افسانہ نگار، محقق اور صحافی وغیرہ کی اپنے گھر آمد اور قیام و مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ اختر صاحب کی سیرت و صلاحیت کا جس خوبصورتی سے موصوفہ نے آنکھوں دیکھی تصویریں اتاری ہیں وہ قابلِ ستائش ہی نہیں بلکہ ان کی قلمی قوت کا بے محابہ بیان ہے۔

مضمون ''خوش آمدید'' کی ابتداء ان الفاظ میں ہوتی ہے'' --- ہمارے غریب خانے پر --- مقیم رہے ہیں لیکن فی الحال اس کہکشانِ مذہب و اخلاق کی تصویر پیش نہیں کرتی بلکہ اس کاروانِ ادب و شعر کی تصویر اتارتی ہوں جو یہاں سے گزرا۔۔'' واقعی جس خوش اسلوبی سے اپنے زمانے کی اہم ادبی

سیرتوں کو جاوداں بنایا ہے۔اس کے لئے وہ ہمیشہ یادرکھی جائیں گی۔
محترمہ شکیلہ اختر کے دورِ حیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:۔

پہلا دور:

پیدائش یعنی اگست ۱۹۱۶ء سے مئی ۱۹۳۳ء شادی تک

دوسرا دور:

مئی ۱۹۳۳ء سے ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء یعنی اختر صاحب کے انتقال پرملال تک

تیسرا دور:

مارچ ۱۹۷۷ء سے ۱۰ فروری ۱۹۹۴ء یعنی خود شکیلہ اختر کے انتقال تک

محترمہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھیں، ان کے بعد دو بہن ایک رضیہ رعنا، جو خود ایک اچھی شاعرہ تھیں ان کی شادی پورینی (بھاگل پور کے قریب) ہوئی تھی، وہ بعد میں پاکستان چلی گئیں۔ دوسری بہن صوفیہ فضل تھیں۔ وہ اختر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈی۔آئی۔جی فضل صاحب کی اہلیہ تھیں، ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اختر صاحب کے کوارٹر میں ہی ہوئی۔ موصوفہ کے چھوٹے بھائی آفتاب نے بھی ڈاکٹری کی تعلیم انہیں کے گھر سے حاصل کی اور بعد میں کنیڈا میں مقیم ہو گئے--- پٹنہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے جو بھی رشتہ دار آئے ان میں سے بیشتر شکیلہ اختر کے ہی گھر میں قیام پذیر رہے۔ جبکہ خود شکیلہ اختر کے چمنِ زندگی میں ایک بھی پھول نہیں کھلا اور یہ وہ درد تھا جو ان دونوں کا مشترکہ درد تھا، لیکن عورت چونکہ زیادہ حساس ہوتی ہے۔ لہٰذا شکیلہ نے اس دکھ کو اپنی زندگی کا ایک ایسا المیہ بنا لیا کہ خود ان کا فن ان کی زندگی کا آئینہ بن گیا ہے---اس تلخ حقیقت کا اعتراف خود شکیلہ اختر کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:۔

> ''......... میری زندگی کے دوسرے دور نے میرے دل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس سے پہلے دیہات کی زندگی میرے لئے بڑی پرسکون اور خاموش تھی۔ شادی کے فوراً بعد اختر صاحب کی شدید اور مسلسل علالت نے ہم دونوں کے مضطرب دلوں کو بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا اور ہماری تسکین کے کھلونے بس یہی افسانے اور نظمیں تھیں۔''

(بحوالہ مضمون ذکر لطیف اور افسانہ نگار خاتون کے قلم سے
رسالہ شاعر (آگرہ) اکتوبر/نومبر صفحہ ۱۷)

شکیلہ اختر نے اپنے خاوند کے مزاج اور ذوق کا ہمیشہ خیال رکھا، شادی کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی سال بھی مکمل نہیں ہوا تھا اختر صاحب مہلک بیماری تپ دق (ٹی۔بی) کا شکار ہو گئے اور رانچی سینی ٹوریم کے بستر علالت پر ایک طویل مدت تک دراز رہے۔ محترمہ شکیلہ اختر بھی برابر ان کے ساتھ رہیں اور ایک اچھی شریک حیات ہونے کا فرض ادا کرتی رہیں، ان دنوں کی بیشتر کہانیوں میں اس خاص دور کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ شکیلہ کی کہانی ''بکھرے ہوئے پھول'' ''سیندور کی ڈبیہ'' ''گھریا ویرانہ'' اختر صاحب کا افسانہ ''شادی کے تحفے'' ''سینی ٹوریم کا فقیر'' وغیرہ پڑھیے۔

ویسے اس مرض کا پہلا حملہ انہیں ۱۹۳۰ء میں ہی ہوا تھا جب وہ میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر تعلیم منقطع کر کے پہاڑی علاقے میں جانا پڑا۔ شکیلہ اختر کے گھر اردل ''پام والا'' بھی جسمانی صحت کے حصول کے لئے ہی آئے تھے۔ یہ فطری مناظر سے بھرپور جگہ تھی۔ شکیلہ اختر کا گھر مشترک خاندان کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اپنی دو بہنوں کے علاوہ درجن بھر چچازاد بہنیں تھیں۔ والدین کو بھی شعرو افسانے میں خصوصی دلچسپی تھی۔ گھر میں ''فردوس خیال'' نام کی ذاتی لائبریری تھی جہاں ہر ماہ اُس وقت کے بہترین رسائل آتے تھے اور گھر کے بیشتر لوگ کتب بینی کا شوق رکھتے تھے۔۔۔ شکیلہ اختر کا بچپن بہت خوشگوار اور رئیسانہ ماحول میں گزرا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں دلچسپی انہیں بچپن سے تھی۔ چار سال کی عمر میں اپنے ایک غریب رشتے دار مولوی غفور دادا کے مکتب 'بنات' میں داخلہ لیا تھا۔ اور نو سال کی عمر میں گھر میں بیٹھا دی گئیں۔ اُس زمانے میں پردے کا سخت رواج تھا۔ البتہ گھر کا ماحول اسلامی طرز معاشرت کے ساتھ ساتھ علمی وادبی تھا۔ دس سال کی عمر سے ہی انہیں لکھنے کا شوق ہوا۔ پہلے شعروشاعری میں دلچسپی تھی، وہ بھی غزل کے بجائے نظم نگاری میں، پھر انشائیہ لکھنے لگیں۔۔۔ ۱۹۳۶ء میں پہلا افسانہ بعنوان ''رحمت'' اس زمانے کے مشہور رسالہ ''ادب لطیف'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔

زندگی میں ہی چھ افسانوی مجموعے مع ایک ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' منظر عام پر آچکے تھے اور ادبی حلقے میں ان کی اچھی پذیرائی ہوئی تھی۔ شکیلہ اختر انگنت انعامات واعزازات سے بھی نوازی گئیں۔ وہ ایک بہترین خاکہ نویس بھی تھیں۔ مگر افسوس کہ انہوں نے اپنی اس خوبی کو پہچانا نہیں اور نہ کسی اور نے توجہ دلائی۔

ویسے سہیل عظیم آبادی اور محمد طفیل پر دو با ضابطہ خاکے انہوں نے تحریر کئے ہیں۔ ''ساغر نو'' کے ''اختر اور رینوی نمبر'' میں بعنوان ''خوش آمدید'' میں بھی خاکہ نگاری کے خوبصورت جوہر پوشیدہ ہیں۔

محترمہ شکیلہ اختر ایک سلیقہ شعار خاتون تھیں جنہوں نے فن اور فن کاری کے ساتھ ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کو بھی خوشگوار بنائے رکھا۔ شکیلہ اختر کا جو عہد اور ماحول تھا وہاں عورتوں اور مردوں کی طرز زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا، عورتیں حجاب اندر حجاب تھیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ شکیلہ اختر کی تصویر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اختر اور رینوی نمبر میں بھی وہ کہیں نظر نہیں آتی ہیں۔ البتہ اپنی تحریر میں وہ چلتی پھرتی نظر آرہی ہیں۔ اُس زمانے میں خصوصی طور پر مسلم معاشرے میں عورتوں کی تعلیم کا رواج بہت کم تھا، شادی بھی کم عمری میں ہو جاتی تھی، خود شکیلہ اختر کی شادی کا ذکر محض گیارہ سال کی عمر سے ہونے لگا تھا اور شادی سولہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔

شکیلہ اختر کے جدِ اعلیٰ تبلیغ کے لئے ایران سے ہندوستان تشریف لائے۔ ان کا نام حضرت مخدوم شاہ زین الدین تھا۔ انہوں نے گیا ضلع کے ارول قصبہ میں اپنا مسکن بنایا۔ آپ دو بھائی تھے۔ دوسرے بھائی کا نام مخدوم شاہ شمش الدین تھا۔ شکیلہ اختر کے اجداد میں شاہ عمر اور شاہ زبیر مونگیر کے تھے۔ جنگ آزادی کے نامور سپہ سالار میں ان حضرات کا نام لیا جاتا ہے۔ مونگیر میں '' شاہ زبیر روڈ '' اور شاہ فیملی انہیں لوگوں کی یادگار ہے کانگریسی لیڈر محمد طارق انور بھی رشتے میں ان کے بھانجہ تھے۔

محترمہ کے والد دو بھائی تھے، شاہ محمد توحید اور شاہ محمد رشید، پیشے سے دونوں ڈاکٹر تھے، چھوٹے بھائی آفتاب بھی ڈاکٹر ہیں وہ کنیڈا میں قیام پذیر ہو گئے، خود اختر اور رینوی بھی میڈیکل کے طالب علم تھے لیکن صحت سے مجبور ہو کر میڈیکل کی پڑھائی چھوڑ کر آرٹس میں اردو مضمون کا انتخاب کیا اور ایک کامیاب استاد، پُر تاثیر مقرر، ناقد، محقق، افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر---غرض کہ کئی حیثیتوں سے کافی مشہور و مقبول رہے۔

شکیلہ اختر کے والد محترم ڈاکٹر شاہ محمد توحید ارول گاؤں میں سون ندی کے کنارے '' پام وِلا '' میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی شادی سید ارادت حسین کی بڑی صاحبزادی صالحہ خاتون (شکیلہ اختر کی والدہ) سے ہوئی تھی۔ دوسرے بھائی شاہ محمد رشید کی شادی ارادت حسین کی چھوٹی صاحبزادی میمونہ خاتون سے ہوئی، گویا دونوں بہن ایک ہی گھر میں آگئیں ۔۔ اسی طرح شکیلہ اختر اور صوفیہ فضل بھی ایک ہی گھر میں

آئیں۔ دراصل قادیانیت اس وقت ایسا مسلک تھا جو بہت عام نہیں تھا۔ اچھے رشتے کی تلاش سے زیادہ مذہب و مسلک کو فوقیت دینے کا جذبہ عام تھا۔

محترمہ شکیلہ اختر کی پرورش زمیندارانہ ماحول میں نہایت عیش و عشرت میں ہوئی تھی، والدین کی چہیتی اور چہیتی اولاد تھیں۔ اپنے عہد طفولیت کو یاد کرتے ہوئے موصوفہ لکھتی ہیں:-

''......... میری زندگی میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا کبھی کوئی دن نہیں آیا، لیکن میرا گھر علم و ادب کا مرکز تھا۔ اماں جان اور ابا جان دونوں کو ہی ادب اور شعر و شاعری کا گہرا ذوق تھا۔ اس لئے گھر پر ''نیرنگ خیال''، ''ہمایوں''، ''ایشیا''، ''تہذیب''، ''عصمت''، ''عالم گیر''--- پرچے آتے تھے۔ اماں جان لیمپ کی روشنی میں روزانہ رات کو پرچوں ہی سے اچھے اچھے افسانے ابا جان کو سنایا کرتی تھیں۔ ان ہی افسانوں میں سے ایک افسانہ ''سرخ جوڑا'' بھی تھا جو ایک بنگالی افسانہ کا ترجمہ تھا۔ میری عمر اس وقت دس سے زائد نہ ہوگی لیکن مجھے یہ کہنے میں بھی تکلف نہیں کہ اس افسانہ کے شدید تاثر نے میرے دل میں افسانہ لکھنے کی تحریک پیدا کی۔ میرا سب سے پہلا افسانہ ''رحمت''، ''ادب لطیف'' میں چھپا، یہ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا۔''

بعد کی تحقیق نے شکیلہ اختر کے پہلے افسانہ کی اشاعت کی تاریخ ۱۹۳۶ء بتائی ہے۔ بہرحال متفقہ طور پر نقادوں اور خود مصنفہ نے بھی ۱۹۳۶ء کو ہی مستند قرار دیا ہے۔ بقول چھوٹی بہن صوفیہ فضل جب وہ (شکیلہ اختر) دس سال کی تھیں تو اسی وقت انہوں نے پہلی بار شعر لکھا تھا--- لیکن محترمہ کے انشائیے اور شاعری کے نمونے ہنوز نایاب ہیں، ان کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز افسانہ ''رحمت'' سے ہوتا ہے۔ اس افسانہ کی اشاعت کی تاریخ ۱۹۳۶ء ہے۔ یعنی شادی کے بعد ہی وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئیں۔ اختر صاحب کی قربت نے واقعی سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس حقیقت کا اعتراف خود مصنفہ نے بھی کیا ہے:-

''میرے پاس کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں، لیکن اختر صاحب نے دنیا بھر کا علم بھی سکھایا--- میں تو کچھ بھی نہیں تھی، انہوں نے میرے شوق کو سنوارا۔ دنیا بھر کی علمی اور ادبی کتابوں کا میرے آگے ڈھیر لگا دیا۔ میری زندگی میں ایک بہت

ہی پیارا سورج اپنی پوری تابنا کیوں کے ساتھ روشن تھا ---! اب تو کچھ بھی نہ رہا،
دل جب بری طرح گھبرانے لگتا ہے تو افسانے لکھنے لگتی ہوں ۔''
(بقلم شکیلہ اختر ،مکتوب بنام عظیم اقبال)

یہ تحریر اختر اورینوی صاحب کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد کی ہے ۔ ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء میں اختر صاحب اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے تھے اور ان کی خوبصورت یادوں کے سہارے شکیلہ اختر اپنی زندگی کے روز و شب گزار رہی تھیں، خوبی کی بات یہ تھی کہ قلم کا رشتہ ہنوز قائم تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد بھی وہ لکھتی رہیں، پٹنہ کے مختلف ادبی سرکل کی ممبر رہیں، بہار سرکار کی طرف سے وظیفہ بھی ملتا رہا۔۔۔ اردو اکاڈمی اور پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کی مشاورتی کمیٹی کی کئی سال تک ممبر رہیں۔ مختلف سیمیناروں وغیرہ میں بھی شرکت کرتی رہیں۔

۱۹۸۴ء، ماہ ستمبر میں بہار اردو اکاڈمی کے عملہ واراکین کے ساتھ بھاگل پور تشریف لائی تھیں۔ اختر صاحب کے شاگردِ عزیز پروفیسر لطف الرحمن صاحب کے دولت کدے پر ان کا قیام تھا۔ ہم تمام شاگردانِ اختر اورینوی کو پروفیسر لطف الرحمن صاحب نے محترمہ سے ملاقات کرنے کی غرض سے مدعو کیا تھا ۔ زہے نصیب وہ وقت بھی کتنا خوبصورت تھا ---شکیلہ آپا سے ملاقات کے بعد ہم لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ یہ وہی شکیلہ اختر صاحبہ ہیں جن سے ملاقات کرتے وقت گھبراہٹ ہوتی تھی ۔ آج وہ اس قدر نرم گفتار اور خوش مزاج ہوگئی ہیں کہ ہم سبھوں کو پٹنہ اپنی رہائش گاہ پر آنے کی پُر خلوص دعوت دے رہی ہیں ۔

ع

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

دراصل کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں اس کے ماحول اور حالات کا بہت اہم رول ہوتا ہے ---میں جب پہلی بار دسمبر ۱۹۷۰ء میں ان سے ملی تھی تو اختر اورینوی صاحب ایک طویل مدت سے بستر علالت پر تھے۔ مرض بھی بے حد اذیت ناک تھا۔ خود شکیلہ اختر بھی انیمیا (Anemia) کی مریضہ تھیں، وہ اختر صاحب کی خدمت اور تیمارداری کے ساتھ ان کے دوست احباب، رشتہ دار اور شاگردان کی مزاج پرسی اور عیادت سے تنگ آ چکی تھیں، ان کے مزاج میں احساسِ محرومی اور تنہائی پسندی کے ساتھ ساتھ چڑ چڑاہٹ داخل ہوگئی تھی ---شریکِ حیات کی لمبی بیماری، عمر کے ساتھ اپنی کمزور ہوتی ہوئی صحت اور وقت

کی بے رحمی نے انہیں اندر سے مجروح کر دیا تھا، ان کی آواز اور مزاج میں بھی تلخی آ گئی تھی ---ایک مدت کے بعد جب حالات بدلے تو وہ خود بھی بدل گئی تھیں۔ بقول چھوٹی بہن صوفیہ فضل :-

''..........ہم سارے بھائی بہنوں میں آپا (شکیلہ اختر) سب سے زیادہ خلیق، ملنسار، ہنس مکھ اور اٹوٹ محبت کرنے والی ہیں، مگر کبھی اچانک ایسے ہی ہنستے بولتے آپا کو طوفانی غصہ آ جاتا ہے جیسے پہاڑی علاقوں میں یک بیک بدلیاں اُٹھتیں اور بجلیاں چمکتی ہیں اور پھر زور کی بارش ہو کر دفعتاً دُھلا ہوا آسمان صاف نکھر اُٹھتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے ابھی ابھی غصے چڑچڑاہٹ اور بے زاری کے بعد آپا کا سنہرا چہرہ پیار بھری مسکراہٹ سے چمکنے لگتا ہے اور ہم حیران نگاہوں سے یہ تکتے رہ جاتے کہ آپا کا غصہ نقلی تھا یا اُن کی یہ مسکراہٹ نقلی ہے.........''

(بحوالہ مضمون شکیلہ اختر از صوفیہ فضل، رسالہ ''نقوش''
شخصیات نمبر، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

گویا اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ سیماب صفت تھیں، 'کبھی شعلہ اور کبھی شبنم' کی کیفیت سے وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر حیران کر دیتی تھیں۔ صوفیہ فضل ایک اور جگہ رقمطراز ہیں :-

''.........آپا کو فطرت نے بڑا ہی نرم دل اور دور رس نگاہیں بخشی ہیں جس موڑ پر سے ہم لوگ آسانی سے گزر جاتے ہیں، آپا ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں اور اُن کی نگاہوں میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے تھے، اگر روز مرّہ کے اتنے سارے فضول کام آپا کے سپرد نہ ہوتے تو آج وہ افسانوی دنیا میں چھا کر رہ گئی ہوتیں.........''

(بحوالہ مضمون ''شکیلہ اختر'' از صوفیہ فضل، رسالہ ''نقوش''
شخصیات نمبر، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

جس زمانے میں بھاگل پور آئی تھیں (۱۹۸۴ء) اس وقت وہ شری کرشنا پوری اپنے فلیٹ میں مقیم تھیں۔ اختر صاحب کی خوبصورت یادوں کے ساتھ وہ تنہائی کے شدید درد کو جھیل رہی تھیں، بیوگی اور لا ولدی کے غم نے اس عمر میں ان کی شخصیت کو شکست کی آواز بنا دیا تھا۔ وہ جینے کے بجائے عمر کے آخری

پڑاؤ میں موت کے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ اور اب ہم لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ ع

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے؟

دراصل ہم مردہ پرست لوگ کسی بھی فن کار کی زندگی میں اس کی صحیح قدر و قیمت نہیں پہچان پاتے ہیں۔ جب ہی تو عمر کے آخری ایام میں محترمہ شکیلہ اختر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں:

''.......... زندگی کے ریگستانوں کو بڑی مشکل سے پار کرتی ہوئی موت کے دریا میں اب پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ پتہ نہیں کس وقت موت کی دھارا اپنی تڑپتی ہوئی موجوں میں بہا کر لے جائے---''

(ایک نجی خط سے)

دس (۱۰) فروری ۱۹۹۴ء میں موت کو لبیک کہا۔ حالانکہ ۷۷ رسال کی عمر طبعی ایک فن کار کے لئے لمبی عمر نہیں کہی جائے گی---آخر میں، میں اردو کے محبوب شاعر فیض احمد فیض کے ایک شعر پر اس باب کا خاتمہ کرتی ہوں، آئندہ ابواب میں محترمہ کے فن اور تخلیقی سفر کا جائزہ لیا جائے گا۔ ملاحظہ ہو فیض کا درج ذیل شعر۔

کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں، نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے

ادبی تخلیقات/ افسانوی تصنیفات/ تالیفات کا سلسلہ وار تعارف

شکیلہ اختر اردو افسانہ نگاری کا ایک معتبر نام ہے۔ وہ بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہونے کا شرف رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت محض بنیادگزار کی نہیں، بہار میں ہی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی اردو افسانہ نگاری کا جائزہ لیا جائے گا تو شکیلہ اختر کے ذکر کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر محترمہ کے کل چھ افسانوی مجموعے اور ایک ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' ہے۔ ذیل میں ان کی فہرست تاریخی ترتیب کے لحاظ سے دی جارہی ہے:۔

نمبر شمار	افسانوی مجموعے کا نام	طباعت	سنہ اشاعت
۱:	''درپن'' (طبع زاد)	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۳۷ء
۲:	''آنکھ مچولی''	قادری پریس، نور منزل، محمد علی روڈ ممبئی ۳	۱۹۴۰ء
۳:	''ڈائن''	مکتبہ اردو، رمنہ روڈ، پٹنہ	۱۹۵۲ء
۴:	''آگ اور پتھر''	رام نرائن لعل بنی پرساد، الہ آباد	۱۹۶۷ء
۵:	''لہو کے مول''	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۴	۱۹۷۶ء
۶:	''آخری سلام''	نامی پریس، لکھنو	۱۹۸۶ء
۷:	(ناولٹ) ''تنکے کا سہارا''	نصرت پبلکیشنز، لکھنو	۱۹۷۵ء

''تنکے کا سہارا'' میں کل تین طویل افسانے ہیں۔ عنوانات اس طرح ہیں۔

(I) ''تنکے کا سہارا'' (II) ''سرحدیں'' (III) ''منزل''

موصوفہ اپنی ادبی خدمات کے لئے انگنت انعامات واعزازات سے بھی نوازی گئی تھیں۔ وہ

ایک بہترین خاکہ نویس بھی تھیں۔ '' ساغرِ نو '' کے اختر اور ینوی نمبر میں '' خوش آمدید '' کے علاوہ سہیل عظیم آبادی اور محمد طفیل پر ان کے خاکے بے حد معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ بہار کے لوک گیت پر بھی ان کی تحریر قابلِ قدر ہے۔ موصوفہ جب تک زندہ رہیں، پٹنہ کے مختلف ادبی سرکل کی رکن رہیں۔

افسانوی مجموعوں کا تعارف

'' درپن ''۔ شکیلہ اختر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس کی اشاعت لاہور میں ہوئی تھی، اس مجموعہ میں کل ۱۴/افسانے درج ذیل عنوانات کے تحت ہیں۔ (۱) '' بکھرے ہوئے پھول '' (۲) '' بزدل '' (۳) '' نئے طریقے '' (۴) '' لوکٹ '' (۵) '' انتظار '' (۶) '' شہناز '' (۷) '' شفیق '' (۸) '' سڑک پر '' (۹) '' ایک بیل '' (۱۰) '' بوڑھا مدرس '' (۱۱) '' تین تارے '' (۱۲) '' کچے دھاگے '' (۱۳) '' سہاگ '' (۱۴) '' سرخ بندی ''

دوسرا مجموعہ بنام '' آنکھ مچولی '' شعبہ اردو نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلکشنز لمیٹیڈ ممبئی سے ۱۹۴۸ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس مجموعہ میں کل گیارہ افسانے ہیں۔ ان میں '' بزدل '' پہلے مجموعہ میں بھی شامل ہے۔ عنوانات کی ترتیب اس طرح ہے۔ (۱) '' اعتراف '' (۲) '' بزدل '' (۳) '' مدوجزر '' (۴) '' انتخاب '' (۵) '' تم کس نگری میں بستے ہو؟ '' (۶) '' آنکھ مچولی '' (۷) '' پکار '' (۸) '' بے چاری '' (۹) '' صدائے واپسی '' (۱۰) '' سوکھا ہوا پودا '' (۱۱) '' کیڑے '' ------ فنی اعتبار سے اس مجموعہ کی بعض کہانیاں خاصی کامیاب ہیں۔ مثال کے لئے '' آنکھ مچولی '' اور '' کیڑے '' نہ صرف شکیلہ اختر کے نمائندہ افسانے ہیں بلکہ اردو افسانے کی تاریخ میں یادگار رہیں۔ اکثر ناقدوں نے '' آنکھ مچولی '' کو ان کی خودنوشت بھی کہا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر یہ ایک بہترین نفسیاتی افسانہ ہے۔ یہ افسانہ نصاب میں بھی شامل ہے۔

'' انتخاب '' بھی ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ اس میں جوان ہوتی ہوئی معصوم کم عمر لڑکی کے نفسیاتی دباؤ کو پیش کیا گیا ہے۔ مُنّی اپنی بڑی بہن شہناز اور شمو بھائی کے خطوط اور تحائف کو ایک دوسرے تک لے جاتے ہوئے خود اس قسم کی خواہش کا شکار ہو جاتی ہے اور کسی انجان آدمی کو خط لکھنے لگتی ہے۔ '' اعتراف ''، '' بزدل ''، '' مدوجزر ''، '' تم کس نگری میں بستے ہو؟ '' '' پکار '' وغیرہ افسانے اپنے عنوان سے ہی عشقیہ روئداد کی پیش کش معلوم ہوتے ہیں۔ اس خاص دور میں محترمہ کے بیشتر افسانے رومانی ہیں۔ مگر اس رومانیت میں بھی تلخ حقیقت کی پرچھائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اپنے ابتدائی افسانوں میں محترمہ نے ناکام

محبت کے المیے کو پیش کیا ہے۔

شکیلہ اختر نے اپنے ارد گرد کے ماحول سے موضوع اور مواد تلاش کیا ہے۔ان کا جو عہد اور ماحول تھا اس میں عورتوں اور مردوں کی طرز زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔عورتیں حجاب اندر حجاب تھیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ''اختر اورینوی نمبر'' میں ان کی ایک بھی تصویر نہیں ہے۔دیگر جگہوں میں بھی ان کی تصاویر نایاب ہیں۔خصوصی طور سے مسلم معاشرے میں عورتوں کی تعلیم کا رواج کم تھا۔خود شکیلہ اختر بھی علم کی پیاس رکھتے ہوئے صرف ۹ سال کی عمر میں اپنے قصبہ کے مدرسہ ''بنات'' سے تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے گھر میں پردے میں بیٹھا دی گئی تھیں۔اس مدرسہ میں انہوں نے ۴ سال کی عمر میں داخلہ لیا تھا۔مولوی غفور دادا سے قرآن پاک اور اردو عربی کی تعلیم کم عمری میں ہی حاصل کر لی تھی۔البتہ گھر کا ماحول اسلامی طرز معاشرت کے ساتھ ساتھ خالص علمی و ادبی تھا۔والد اور والدہ دونوں کو شعر و ادب سے شدید دلچسپی تھی۔''فردوسِ خیال'' نام کی ذاتی لائبریری تھی۔جہاں اس زمانے کے مشہور و معروف رسائل آتے تھے۔دس سال کی عمر سے ہی انہیں لکھنے کا شوق ہوا۔ابتداء میں شعر و شاعری میں دلچسپی تھی وہ غزل کے بجائے نظم نگاری کی طرف رجوع ہوئیں، پھر انشائیہ لکھنے لگیں۔ایک جگہ انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا ہے:-

> ''......میں نے ۱۹۳۶ء سے افسانہ لکھنا شروع کیا، جب کہ میری عمر صرف ۱۵ سال تھی۔میرا پہلا افسانہ بھی ''ادب لطیف'' جیسے چوٹی کے معیاری رسالہ میں چھپا تھا اور صرف چھپا ہی نہیں تھا، ایڈیٹوریل میں پورا صفحہ میرے افسانہ کی تعریف سے بھرا ہوا تھا۔مجھے پُر خلوص طور پر یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ میں شاعری چھوڑ کر صرف افسانہ لکھا کروں، تب سے آج تک میرے افسانے ''ادب لطیف''، ''افکار'' اور ''نقوش'' میں چھپتے رہے ہیں......''

تیسرا مجموعہ ۱۹۵۲ء میں ''ڈائن'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔لیتھو پریس پر کتابت اور طباعت معمولی ہے مگر اس مجموعہ میں شامل افسانے ان کی ادبی شہرت کا سبب بنے۔کُل ملا کر بارہ افسانے ہیں جن کی ترتیب اس طرح ہے۔(۱) ''ڈائن'' (۲) ''پیاسی نگاہیں'' (۳) ''نفرت'' (۴) ''بن تتلی'' (۵) ''ایک دن'' (۶) ''دھندلکا'' (۷) ''قرار'' (۸) ''شاید'' (۹) ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' (۱۰) ''موسیٰ'' (۱۱) ''گھر یا ویرانہ'' (۱۲) ''مظلوم''

ہمارے پیش نظر ''ڈائن'' ان کی شاہکار کہانی ہے۔ موضوع، زبان و بیان، کردار کے لحاظ سے مکالمے اور ان کی سیرت نگاری، جزئیات پسندی اور روز مرّہ کی زندگی کا وہ نقشہ جہاں امیری اور غریبی کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے غریب طبقے سے ان کی ہمدردی، ان کے گہرے مشاہدات اور محسوسات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانے روحِ عصر کی بھر پور ترجمانی کرتے ہیں۔ آج دلت ادب چرچے میں ہے مگر آج سے ۵۷ سال قبل شکیلہ اختر نے اس طبقے کی سیرت اور احوال کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اس کے لئے وہ ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ افسانہ ''موسی'' کرشن چندر کے افسانہ ''کالو بھنگی'' کے مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے بعض بے حد کامیاب افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً اس مجموعہ کی کہانی ''مظلوم'' ایک ایسے نسائی کردار کو سامنے لاتی ہے جو اس وقت کے قومی، سماجی اور معاشرتی احوال و آثار کو افسانوی طرز میں بڑی ہنر مندی سے نگاہوں کے سامنے لا رہی ہے۔ افسانہ ''ایک دن''، ''آگ اور پتھر''، ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا''، ''گھر یا ویرانہ''، ''سرحدیں'' وغیرہ میں موصوفہ نے بہار میں فسادات کے اثرات کو حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ریلیف کیمپ کا منظر ہو یا ماتم زدہ سوکھے ہوئے چہرے، بچے بوڑھے، جوان، مرد باہر برآمدے اور صحن میں اور گھر کے اندر عورتیں، اونچے اونچے، اوسط درجے کے گھرانوں والیاں، کسی نے چادر، پھٹی ہوئی کمبل اور برقعے کے ٹکڑے سے ہی اپنے کو ڈھاک رکھا تھا۔ ضرورتیں ان کے چہروں سے برس رہی تھیں۔ مگر ان کی زبانوں پر جیسے سکتہ لگ گیا تھا۔

مجموعہ ''ڈائن'' اور دیگر افسانے کی ادبی حلقے میں پذیرائی کے بعد ۱۹۶۷ء میں ''آگ اور پتھر'' الٰہ آباد سے شائع ہونے والا محترمہ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں درج ذیل تیرہ افسانے ہیں۔ (۱) پیاسی نگاہیں (۲) آگ اور پتھر (۳) مظلوم (۴) ننگی آنکھیں (۵) موسی (۶) بھٹکی ہوئی منزل (۷) محاذ (۸) ایک دن (۹) لجیا (۱۰) گھر یا ویرانہ (۱۱) گریز (۱۲) بیگار (۱۳) بجھتے ہوئے چراغ---
اس مجموعہ کی کئی کہانیاں مجموعہ ''ڈائن'' میں بھی شامل ہیں۔ دراصل جو افسانے زیادہ مقبول ہوئے ہیں انہیں انہوں نے دوبارہ اس خیال کے تحت شامل کر لیا ہے کہ وہ قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ اگر ایک مجموعہ ختم ہو گیا تو دوسرا سامنے آ جائے گا ''پیاسی نگاہیں''، ''گھر یا ویرانہ''، ''منزل''، ''موسی''، ''لجیا'' وغیرہ شکیلہ اختر کے خوبصورت افسانے ہیں۔ خود محترمہ کو بھی ان کہانیوں میں اپنی زندگی، عہد اور ماحول کی

کروی سچائیاں نظر آرہی ہیں۔اس لئے وہ اسے یادگار بنانا چاہتی تھیں۔

پانچواں افسانوی مجموعہ ''لہو کے مول'' ہے۔جس کے مرتب پروفیسر اسلم آزاد ہیں۔کل بارہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا تھا۔افسانوں کی ترتیب ملاحظہ ہو۔

(۱) ڈائمنگ (۲) باسی بھات (۳) پوپلی (۴) جھنڈا اونچا رہے ہمارا (۵) ٹوٹی ہوئی گڑیا (۶) خش بختا (۷) دھندلکا (۸) سیندور کی ڈبیہ (۹) قرار (۱۰) چار کوردار ساڑیاں (۱۱) گز بھر کفن (۱۲) لہو کے مول۔

گز بھر کفن، لہو کے مول، دھندلکا، سیندور کی ڈبیہ وغیرہ فنی اور فکری دونوں اعتبار سے شکیلہ اختر کے کامیاب افسانے ہیں۔ان تمام کی تفصیل میں جانے سے بہتر یہ ہوگا کہ ان کے تخلیقی سفر کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر دیا جائے۔

چھٹا اور آخری مجموعہ ''آخری سلام'' ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔اس مجموعہ میں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے شکیلہ اختر نے اپنے قارئین کو مستقبل کی پیشن گوئی کرتے ہوئے علامتی انداز میں آخری سلام پیش کیا ہے۔واقعی اس آخری سلام کے بعد پھر ان کا کوئی مجموعہ سامنے نہیں آیا۔اس مجموعہ میں کل ملا کر پندرہ افسانے ہیں۔عنوانات نیچے درج کیے جا رہے ہیں۔

(۱) آہ کی صدا نکلی (۲) چائے کی کلھیا (۳) سلمتا (۴) ٹھنڈی اگنی (۵) تلاش منزل (۶) بے نام (۷) منگلہ ہاٹ کی راجکماری (۸) جلتے ہوئے البم (۹) سویا ہوا خدا (۱۰) چھین لے مجھ سے میرا حافظہ (۱۱) ایک عجیب سی لڑکی (۱۲) فیس پاوڈر (۱۳) اسٹیل والا (۱۴) گینگرین (۱۵) آخری سلام۔

اس مجموعہ کے کئی افسانے خاصے طویل ہیں۔جیسے ''ٹھنڈی اگنی'' --- خدا بخش لائبریری کے فکشن سیمینار میں اس افسانہ کو ''سرد اگنی'' کے نام سے سنایا تھا۔خوش قسمتی سے میں بھی اس بین الاقوامی سیمینار میں شامل تھی۔ جناب کلام حیدری مرحوم صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔شکیلہ اختر کی باری جب کہانی سنانے کی آئی تو وہ کہانی سناتے سناتے اس قدر جذباتی ہو گئیں کہ ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی، ان کے قارئین کہانی کے الفاظ بھول گئے اور انہیں مبہوت ہو کر دیکھنے لگے، ان کی آواز دھیمی درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ غالباً اس وقت وہ علیل بھی تھیں۔اس لئے کہانی تو مجھے بھی پوری طرح سمجھ میں نہ آسکی تھی۔مگر افسانہ نگار کا خود اپنے افسانے کا ایک زندہ کردار بن جانا مجھے آج بھی یاد ہے۔کہانی کا عنوان ''سرد اگنی'' ہی تھا۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؂

دن تو آتے ہیں گزر جاتے ہیں
یادیں رہ جاتی ہیں ڈسنے کے لئے

ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' نصرت پبلکشنز الہ باد سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ ہمارے پیش نظر ''تنکے کا سہارا'' دراصل ایک طویل افسانہ ہے اس افسانہ میں بھی لاولدی اور بیوگی کا درد اس طرح دکھایا گیا ہے کہ ایک لاوارث بچی کو مسز لال نے گود لیا ہے۔ مسز لال اور ڈاکٹر کمار صاحب کی ویران زندگی میں یہ بچی رشتہ، اشتراک قائم کرنے کا سبب بنی ہے۔ گویا یہ بچی مسز لال کی زندگی میں تنکے کا سہارا بن جاتی ہے ۔موضوع کے لحاظ سے یہ افسانہ صحت مند نظریہ، حیات کو پیش کرتا ہے۔ یتیم اور لاوارث بچوں کو گود لے کر خود کے ساتھ سماج میں ایسی لاولد خاتون کے مسائل کو بھی آسان بنانا چاہا ہے۔ ''سرحدیں'' اور'' منزل'' ناولٹ کے زمرے میں ہیں۔ یہاں نسائی کردار کے ساتھ ساتھ مردانہ کردار بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ڈاکٹر زاہدی خاصا متاثر کرنے والا کردار ہے۔ ناولٹ ''منزل'' میں زاہدی، افسانہ ''بکھرے ہوئے پھول'' میں ڈاکٹر احسان اختر صاحب کی یاد دلاتا ہے۔

آخری عمر میں ''موج اور ساحل'' نام سے موصوفہ ایک ناول لکھ رہی تھیں مگر یہ مکمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۸۳ میں اختر اورینوی کے قلم سے لکھے گئے ''شذرات'' جن کی تعداد ۳۲ ہے، کو ترتیب دے کر'' گزارش'' کے نام سے شائع کرایا اور قارئین سے بحثیت صحافی اختر صاحب کو روشناس کرایا ہے۔ دیگر ادبی، لسانی اور سماجی خدمات میں ''مطالعہ مومنؔ'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ یہ کتاب ساہتیہ کلا، الہ آباد سے ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ ادب اطفال یعنی بچوں کے ادب میں بھی چند کہانیاں اور مضامین ان کے قلمی نمونے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کی ایڈوائزری کمیٹی کی رکن رہیں اور چند مضامین وہاں سے بھی نشر ہوئے ہیں۔

رسالہ ''نقوش'' لاہور دسمبر ۱۹۶۱ء میں ''بہار میں شادی کی رسمیں'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا جس مین دولہا دولہن سے متعلق بہار میں جو رسمیں شادی بیاہ کے موقع پر ہوتی ہیں، ان کا تفصیلی ذکر ہے۔ کہیں کہیں لوک گیت بھی ہیں جسے باضابطہ ''بہار کے لوک گیت'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ تحریریں کافی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ ''لوک ادب'' یعنی فوک لٹریچر پر یہ ایک دلچسپ تحقیقی مقالہ ہے۔ خود مصنفہ کے الفاظ میں:-

''بہار میں شادی بیاہ کے موقع پر جو لوک گیت گائے جاتے ہیں ان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ٹونے، جوگ، شہانے اور جھومر.......... ٹونے گا کر دولہا کو دولہن کا مرید بناتے ہیں۔ ٹونے ہمیشہ طاق میں گائے جاتے ہیں۔ پانچ، سات، گیارہ یا اکیس ٹونے کے بعد شہانا گایا جاتا ہے۔ یہ دولہن اور دولہا کی خوبصورتی، زیور اور کپڑوں کے گیت ہوتے ہیں، اس کے بعد جوگ گایا جاتا ہے۔ یہ گانا بھی ٹونے ہی کی طرح جادو اور سحر والا ہوتا ہے، اس میں بنگال کے جادو کا تذکرہ ہوتا ہے اور دولہا بے چارہ بنگال کے جادو سے زندگی بھر اپنی بیوی کے آگے بھیڑ بنا رہتا ہے۔ آخر میں جھومر کے گیت گائے جاتے ہیں۔ جھومر کے گانے بہت ہی پیارے اور محبت میں ڈوبے رہتے ہیں۔''

افسانوی خدمات کا تنقیدی محاکمہ/ جائزہ

(جس سے نگارشات کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہو سکے)

افسانوی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے اردو افسانہ نگاری کو کل پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے جو تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اس طرح ہیں:-

پہلا دور ۱۹۰۵ء تا ۱۹۳۰ء

دوسرا دور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۶۰ء

تیسرا دور ۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء

چوتھا دور ۱۹۸۰ء تا ۲۰۰۰ء

پانچواں دور ۲۰۰۰ء تا عہد حاضر (۲۰۲۱ء)

اب تک کی تحقیق کی روشنی میں اس پہلے دور میں کسی خاتون افسانہ نگار کا نام بہار کی سطح پر دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ اس خیال سے تمام علمائے ادب اتفاق کرتے ہیں کہ محترمہ شکیلہ اختر بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو میں افسانہ نگاری کی ابتداء کی بلکہ اپنی ۵۵ سالہ ادبی زندگی میں اس فن کو ایک خاص مقام تک پہنچا دیا جہاں سے آگے کا سفر طئے کرنا آسان ہو گیا۔ محترمہ شکیلہ اختر کا پہلا افسانہ بعنوان ''رحمت'' ۱۹۳۶ء رسالہ ''ادب لطیف''، لاہور میں شائع ہوا تھا۔ ادبی حلقے میں اس افسانہ کی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔

اس طرح شکیلہ اختر کا ادبی وتخلیقی سفر ۱۹۳۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۸۶ء کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ گویا ان کے لکھنے کی ابتداء ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ ہے ۱۹۶۰ء کے بعد محترمہ نے جدیدیت کا دور بھی دیکھا اور ۱۹۸۰ء کے بعد مابعد جدیدیت بھی--- پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر اختر اورینوی کی اہلیہ ہونے کی وجہ سے ان کے دولت کدہ پر ترقی پسندوں کی بھیڑ بھاڑ بھی رہی اور

جدیدیت کے علم برداروں کا آنا جانا بھی برابر تھا۔ خود موصوفہ کا رپورتاژ نما طویل مقالہ ''خوش آمدید'' ان کے اس دور کے روز و شب کا بہترین ترجمان ہے۔ اس مقالہ کو پڑھنے سے اختر صاحب کے ساتھ ساتھ خود شکیلہ اختر کی سیرت کی بھی انگنت خوبیاں سامنے آتی ہیں۔

شکیلہ اختر کو لکھنے کا شوق کم عمری سے تھا، مگر وہ کسی تحریک یا ازم سے وابستہ نہیں رہیں۔ بلکہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ اپنے اردگرد کے ماحول و مناظر سے اپنی کہانیوں کے لئے مواد تلاش کر لیتی تھیں۔ انہوں نے جو محسوس کیا اسے خوبصورتی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے ہنر سے واقف تھیں۔ وہ بے حد حساس اور دردروں میں تھیں۔ جزئیات نگاری، ماحول سازی اور منظر کشی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کی بیشتر کہانیاں خود ان کی ذات سے گہری وابستگی رکھتی ہیں۔ مثال کے لئے ''آنکھ مچولی'' پروفیسر محمد محسن کے افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' کے طرز کا خوبصورت نفسیاتی افسانہ ہے۔ مرکزی کردار پروین کی کردار نگاری جس ہنر مندانہ انداز میں کی گئی ہے اس کا جواب نہیں۔ عام نظر میں تو یہ خود افسانہ نگار کی روداد حیات معلوم ہوتی ہے مگر ان کے انداز پیش کش نے اس افسانہ کو--- ع

سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

کا اسلوب عطا کیا ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی نفسیات کا بے محابہ بیان ہے جو خود مصنفہ بھی ہو سکتی ہیں اور دنیا کے کسی گوشے کی وہ مظلوم عورت جو ماں بننے کی آرزو میں کیسے کیسے رنگین خواب بنتی رہتی ہے۔ انجام میں تلخ حقائق کی کرچیاں افسانہ کے کردار کے ساتھ قاری کو بھی بہت اندر تک چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں--- لاولدی کا غم ایک لازوال درد ہے جس کی شدید چبھن کو شکیلہ اختر نے اپنے اکثر افسانوں میں بے حد فنکارانہ ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کے الفاظ میں :-

> ''شکیلہ اختر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذات کے کرب کو وسعت دے کر اسے ہمہ گیر بنا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کا افسانہ ''آنکھ مچولی'' ہے۔''

فن اور فنکار کا رشتہ بھی کیسا عجیب و غریب ہے۔ خصوصی طور سے افسانہ نگاری کی صنف تو کبھی کبھی تلاش ذات کی وہ منزل ہے جہاں سے فنکار کے اندرون کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ شکیلہ اختر کے بیشتر افسانوں میں آپ بیتی کا سارنگ ہے۔ مثال کے لئے ''بکھرے ہوئے پھول'' ''گھر یا ویرانہ''

آخری سلام''، ''سرداگنی''، ''پیاسی نگاہیں''، ''سیندور کی ڈبیہ'' اور ''تنکے کا سہارا'' وغیرہ کا مطالعہ کریں۔ چند نمائندہ افسانوں میں ''ڈائن''، ''کیڑے''، ''موسی''، ''گینگرین''، ''گز بھر کفن'' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے---''

موسی'' کرشن چندر کے ''کالو بھنگی'' سے متاثر ہو کر لکھا گیا افسانہ ہے۔ بلکہ فنی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ''کالو بھنگی'' کے مدمقابل ''موسی'' زیادہ فطری اور حقیقی انداز پیش کش ہے۔ غالباً اسی لئے اس کا اثر بھی کچھ زیادہ ہی تیر نیم کش جیسا ہے۔ موسی کے علاوہ لجیا، مظلوم، نفرت، خوش بختا، باسی بھات، محاذ، کیڑے، دو گز کفن وغیرہ افسانوں میں بھی زندگی کے تلخ حقائق کا اتنا بے باک اور چُبھتا ہوا بیان ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کی سرگرمی سے ایک دم غافل تھیں۔ براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر محترمہ اپنے عہد کے بیشتر احوال وکوائف اور خوب وزشت سے واقف تھیں۔ وہ صرف گھر آنگن کی گھریلو افسانہ نگار نہیں، ان کا سماجی شعور بیدار اور بالیدہ تھا۔ زبان و بیان کی سادگی، اچھی کردار نگاری اور فطری انداز بیان ان کے افسانوں کی اصل خوبی ہے۔

موضوع ومواد اور انداز نگارش کے لحاظ سے محترمہ شکیلہ اختر کے افسانے یکسانیت کا شکار نہیں ہیں، اپنے قریب کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ انہوں نے گہرائی اور گیرائی سے کیا تھا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ رومانیت سے زیادہ حقیقت پسندی پر زور دیا ہے بقول فیض ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ''ڈائن'' تلخ حقیقت نگاری اور نئی نسل میں اخلاقی قدروں کی پامالی پر لکھا گیا ایک شاندار افسانہ ہے۔ اسی طرح ''آنکھ مچولی'' اور ''پیاسی نگاہیں'' کردار کے نفسیات کی گرہ کشائی کرتے ہیں۔ ''پیاسی نگاہیں'' بیوہ عورت کا پُر درد بیان ہے۔ روایتی قدروں اور فطری جبلت کا تصادم کہانی کی دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔ انوری باجی کی نفسیاتی کیفیات کا برملا اظہار ملاحظہ ہو:-

''دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ انوری باجی اوپر سے راکھ کا ڈھیر اور اندر سے لپکتا ہوا شعلہ ہیں، اپنے کو بیچاری لاکھ دبانے کی کوشش کرتیں---مگر چہرے کی تمتماہٹ مشکل سے ہی کچھ دیر کے لئے مٹتی تھی۔''

شکیلہ اختر کے بیشتر افسانوں میں بیوگی کا درد اور جنسی گھٹن کے ساتھ جنسی تشنگی کا احساس قاری کو

انسانی جبلت کی سچائی کو محسوس کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

شکیلہ اختر نے اپنے عہد کی خواتین کے مسائل میں بھرپور دلچسپی دکھائی ہے---مرد اساس معاشرے میں خواتین کے استحصال کی انگنت تصویریں ان کے افسانوں اور ناولٹ میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ویسے وہ فیمنسٹ (Faminist) نہیں تھیں اور آج کی اکثر خواتین افسانہ نگاروں کی طرح مرد مخالف بھی نہیں تھیں، اپنے زمانے کی خواتین کے استحصال کا ذمہ دار وہ صرف مرد کو نہیں قرار دیتی ہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔

نئی نسل کی بڑھتی ہوئی آزادی نے جنسی بے راہ روی کے جو مناظر سامنے لائے تھے اس کو بھی انہوں نے نشانہ، ہدف بنایا ہے۔افسانہ ''بن تتلی'' کی نیلو فریا ''بھٹکی ہوئی منزل'' کی شاھدہ کو دیکھئے---یہ کردار بڑے عبرتناک ہیں۔کہیں لاولدی کا غم ہے تو کہیں بے جوڑ شادی کا دکھ، کہیں محبت میں ناکامی کا المیہ ہے تو کہیں غربت کا درد، عام طور پر غریب غرباء اور متوسط طبقے کے مسلم معاشرے کے جانے پہچانے کردار ان کے افسانے اور ناولٹ میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔مثال کے لئے افسانہ ''نفرت''،''اعتراف''،''بزدل''،''مدوجزر''،''سوکھا ہوا پودا''،''بے چارى''،''بیگار''،''صدائے واپسی''،''آخری سلام''وغیرہ کا مطالعہ کیجئے۔زندگی واقعی بڑی نیرنگ ساماں ہے---ایک کامیاب قلم کار کے لئے ضروری یہ ہے کہ وہ حقائق کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرے اور اچھی طرح ہضم کر کے قلم اٹھائے۔افسانے کا فن محض دل بہلانے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کی سچی اور اچھی ترجمانی ہی اصل فن ہے۔اس حقیقت کو جس قلم کار نے محسوس کر لیا تو ع

خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

جیسی کیفیت بیدار ہوتی ہے۔۔فن فن کار کے دل کی آواز ہے۔عام طور پر حقیقت پر اتنا رنگین لبادہ اڑھا دیا جاتا ہے کہ فن اور فن کار کی حقیقت مشتبہ ہونے لگتی ہے۔

آئندہ سطور میں محترمہ کے افسانوں سے چند ایسے اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں جن سے شکیلہ اختر کے افسانوی اسلوب کی امتیازی خصوصیات کی نشاندہی ہوتی ہے:-

''کوٹھری کے اندر چھپر میں گھسی ،لال کاغذ کی ڈولی کا اجلا سا پردا ہوا سے

پھڑ پھڑایا تو چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی نجیبن آپ ہی آپ ہنس پڑی اس ڈولی میں تو
میرے پاؤں کا تلوا بھی نہ گھس سکے گا، پھر یہ پر دا کس کے لئے پھڑک رہا ہے۔
وہ مسکرا دی ہونہہ !دلہانہ ہوا تھان پر سے بھاگا ہوا بیل ہوگا جو کھوج کرنے پر
بھی نہیں مل رہا ہے۔''

(ناولٹ ''سرحدیں'' صفحہ ۶۴ تا ۶۵)

درج بالا مثال میں گاؤں کی معصوم الہڑلڑکی کے جذبات و احساسات کا کس قدر فطری بیان
ہے۔جس میں طنز و مزاح بھی ہے اور سادگی و پرکاری بھی۔۔۔محترمہ کی کردار نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ
اپنے کردار کے اندرون میں بھی جھانکتی ہیں۔محض ظاہری تصویر کشی پر اکتفا نہیں کرتیں۔۔۔اب ان کے
اسلوب کا ایک اور رنگ دیکھئے:-

''نزہت نے تھکے ہوئے انداز سے قلم رکھ دیا، وہ لکھتے لکھتے اکتا گئی تھی، اس نے
بڑی تیکھی نگاہوں سے کمرے کو دیکھا۔رات کی تاریکی میں گہرا سکوت ہر طرف چھا
گیا تھا۔اونچے اونچے محرابوں والے دروازے افسردہ انداز میں کھلے ہوئے تھے
اور موٹے موٹے پردوں سے چھنتی ہوئی نومبر کی سرد اور سمندر کی نمک سے بوجھل
ہوا کمرے کے اندر جیسے سسک رہی تھی اور کمرے سے باہر برآمدے اور صحن میں
تاروں کے جُھنڈ اور ناریل کے درختوں پر ٹھنڈی چاندنی بے ہوش پڑی تھی۔''

(افسانہ۔''قرار'')

اس رومانی انداز بیان کے بعد افسانہ ''آگ اور پتھر'' کی تاجی سے ملئے:-

''یہ اتنا بڑا گھر یہ ہنگامے اس کو ذرا بھی پسند نہ تھے۔جب وہ ایک خزاں رسیدہ
حالت میں پہلی بار محل سرا میں تھی تو وہاں کے بلند و بالا سہ درے کی اونچی اونچی
محرابوں کے نیچے بھی اس نے صرف اپنے آپ کو دیکھا تھا۔باغوں کے کنج میں
،تالابوں کے کنارے،خوب صورت سنگھار میزوں کے لمبے آئنوں میں اور ریشمی
گدے دار بستر پر بھی وہ اکیلی تھی۔ایک بھولی بھٹکی ہوئی لڑکی کی طرح جو صبح سے
شام تک سلاموں کے بوجھ سے تھکی جاتی تھی۔اگر اس کی زندگی کی ابتداء ایسے

غمن کے طور پر نہ ہوئی ہوتی تو یہ اکیلا پن، یہ ویرانہ اور یہ سناٹا اس کی روح میں بسیرا نہ لیتا اور تا جی کو اب انہیں ویرانوں سے نفرت تھی اور وہ اپنی تنہائیوں سے کانپ کانپ اٹھتی تھی۔''

اب ایک ایسی نسائی سیرت سے آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے جس کو دنیا ڈائن کہتی ہے۔ آج سے ۷۰ سال قبل بھی ہماری سوچ کا انداز کیا تھا۔ سماج کے نچلے طبقے کا یہ کردار آج بھی ہمارے آس پاس ہے، مگر ہماری سوچ کیا ترقی پسند ہو سکی ہے؟ غور کیجیے:۔

''........اور بڑھیا کا رکا ہوا سیلاب آخر باندھ توڑ کر بہہ نکلا۔ کالا چہرہ اور بھی چمک اٹھا، آنکھوں کی سفیدی بڑھ گئی اور ہونٹوں کے پاس پلپلاتے ہوئے گوشت تیزی سے ہلنے لگے اور وہ بکنے لگی کہ ''تم کھاؤ پیو اور بھرے پیٹ کا ڈکار لے لے کے خوب بولو۔ مگر جس کا پیٹ جلے ہے وہی نہ جانے کہ دو دن کے فاقہ کے بعد تین آنہ پیسہ اور اس پر سے سوا روپیہ پہلا باقی، کتنی بڑی دولت ہے، پھر وہ اپنا پیسہ آخر کاہے چھوڑے گی؟'' وہ اسامی تھی، رعیت تھی تو مالک راجہ ہو کر کیوں نہ دیکھتے کہ اپنی مچھوائن ۲ دن سے دانہ دانہ کے بنا ترس رہی ہے اور وہ کسی سے بھیک تو نہیں مانگ رہی ہے........ وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی اور اس کی یہ بدتمیزی کی بک بک سنتے سنتے تینوں بہنوں کو سچ مچ میں غصہ آنے لگا۔۔۔'' سردار فیضو! سب کے سب کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو؟ لو یہ تین آنہ پیسہ، جلدی سے نکالو اس کو.... روشی دودھ کے دیگچے میں سے ملائی نکالتے نکالتے پیسے پھینک کر بولی، اپنی طرح ہم لوگ کو بھی فقیرنی سمجھے ہوئے ہے، مگر سردار اور فیضو آگے بڑھنے کی بجائے اور بھی پیچھے ہٹ گئے ''باپ رے! ڈائن ہے ڈائن''۔ اور بڑھیا نے حریصانہ طور سے پیسوں کو سمیٹتے ہوئے گھور کر شنو کو دیکھا اور او سوا گو روپیہ ۔۔۔؟ جو ہیا، حسینا، بدمیاں سب کی سب چھوکری فرشوں، کمروں اور فرنیچروں کو جھاڑتے، پونچھتے چھوڑ چھاڑ کر بڑھیا کے گرد میلا سا لگا کر کھڑی ہو گئیں۔''

(بحوالہ افسانہ ''ڈائن'' از شکیلہ اختر)

زبان و بیان کا یہ انداز ان کے بیشتر افسانوں کی جان ہے، لیکن اختصار کے خیال سے میں نے دو، چار نمونے ہی پیش کئے ہیں۔ عوامی زبان خاص طور سے دیہی عورتوں کی روزمرہ کی زبان، ضرب المثل اور محاورے وغیرہ کو جس خوبی سے اُنہوں نے اپنے افسانوں اور ناولٹ میں پیش کیا ہے، اس سے ان کی کردار نگاری اور ماحول سازی میں حسن پیدا ہوا ہے۔ وہ انسانی نفسیات کی بھی اچھی پارکھ تھیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے موضوعات اور افسانوی اسلوب کے معاملے میں وہ پریم چند اسکول کی نمائندگی کرتی ہیں۔

شکیلہ اختر جزئیات نگار ضرور ہیں مگر فضول گوئی سے پرہیز کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانے آغاز سے انجام تک قاری کو دلچسپی کی ڈور میں باندھے رہتے ہیں۔ ''مردانگی'' ہو یا ''سویا ہوا خدا''، ''تلاشِ منزل'' ہو یا ''چائے کی کلہیا''، ''لچیا'' ہو یا ''دھندلکا''، ''نفرت'' ہو یا ''آنکھ مچولی''، ''مظلوم'' ہو یا ''لہو کے مول''، ''باسی بھات'' ہو یا ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا''، ''کیڑے'' ہوں یا ''ڈائن'' ---- تقریباً بیشتر افسانے ایک واضح تصورِ حیات رکھتے ہیں۔ زندگی اور اس کے مسائل پر ان کی نظر ہمیشہ رہی اور ایک اچھے اور سچے قلم کار کی طرح اُنہوں نے موضوع اور فن کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرتے ہوئے بہت سے کامیاب افسانے تخلیق کئے ہیں۔

البتہ ایک نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شکیلہ اختر کا مطالعہ ہمیں آج کے افسانوی تقاضے کی روشنی میں نہیں کرنا ہے۔ ان کی اہمیت ان کے عہد اور ان کے ماحول کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے کرنا ہے۔ کیوں کہ فن کار اپنے ماحول اور زمانے سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ غالب کی طرح عندلیب گلشن نا آفریدہ نہیں بلکہ اپنے عہد کی آواز تھیں، انہیں ہم عصری نقاش کہہ سکتے ہیں، ان کے افسانوں میں عصری ماحول کی جو آگہی ہے وہ انہیں ایک کامیاب اور باشعور افسانہ نگار کی فہرست میں ان کا مقام بناتی ہے۔ اپنے زمانے کی سماجی، تہذیبی، قومی اور عوامی صورتحال کو جس بہتر طریقے سے انہوں نے اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے اس کے لئے وہ ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ قومی جذبات اور فرقہ وارانہ فسادات کی نہایت سچی تصویریں ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔

کردار نگاری کے فن سے بھی وہ واقف تھیں۔۔ بہت سارے کردار قاری کے سامنے بالکل زندہ کردار کی طرح نقل و حرکت کرتے ہیں۔ مثال کے لئے ''ڈائن'' کی مچھوائن ''آنکھ مچولی'' میں پروین، ''پیاسی نگاہیں'' کی انوری باجی اور شاہدہ، ''موسی'' کی جمعدارن، ''لچیا'' کی معصوم بچی --- چند مردانہ

کردار بھی اپنی پوری اصلیت کے ساتھ قاری کو متاثر کرتے ہیں جیسے ''منزل'' میں ڈاکٹر زاہدی، ''بکھرے ہوئے پھول'' میں ڈاکٹر احسان، ''لجیا'' میں ڈاکٹر انور، ''سرحدیں'' کا اسلم خاں، ''لہو کے مول'' میں مناف میاں وغیرہ بہت دیر تک یاد رکھے جانے والے کردار ہیں---منظر نگاری اور ماحول سازی میں بھی انہیں مہارت تھی۔ ان کی نگاہیں دور رس اور جزئیات شناس تھیں۔ چھوٹا ناگپور کے قبائلی طبقے کی تصویر کشی دیکھئے۔ کس قدر زندگی سے بھرپور ہیں۔

''دھان کے کھیتوں میں بانس کے لمبے چوڑے بھاری بھاری چھاتے لئے کالے کلوٹے جنگلی لڑکے اور لڑکیاں کھڑی ہنس رہی تھیں اور اپنے عریاں جسموں پر رنگین پتھروں کے ہار لٹکائے عورتیں تماشے دیکھ رہی تھیں---جن کے لمبے لمبے بالوں کے جوڑوں میں کاٹھ کی رنگین کنگھیاں لٹکی رہتی تھیں اور لال پتھروں، گھونگھوں اور سیپوں کے ہاروں سے ان کی گردنیں اور سینے بھرے رہتے تھے...... جسم پر بس ایک چھوٹی سی لنگوٹی باندھے رہتے مگر تروتازہ گہرے رنگ کے پھولوں کا گچھا ہر وقت ان کے بالوں میں ٹھنسا رہتا تھا۔''

ساتھ ہی یہ فکر بھی ملاحظہ کیجئے:-

''یہ سب کے سب اس دھرتی کے اپنے بیٹے تھے جس کو اس نے اپنی کوکھ سے جنم دے کر دوسروں کے ہاتھوں اپنے گھروں سے نکلوایا تھا اور اب جنہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا۔''

سینی ٹوریم کا منظر ہو یا دیہی علاقوں میں رہنے والے غریب غرباء کے کردار---ان کی تصویر کشی میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

بقول فکشن کے ناقد پروفیسر ش-اختر:-

''افسانے کے فن پر ان کی گرفت کمزور ہے۔ البتہ مقامی رنگوں مکالموں اور ماحول کی پیش کش میں شکیلہ اختر سے کوئی چوک نہیں ہوتی......''

(بحوالہ کتاب فکری غربت کا المیہ از ش۔اختر صفحہ ۱۰۳)

پروفیسر عبدالمغنی صاحب فرماتے ہیں:-

''شکیلہ اختر کا دائرہ کار خاندانی معاملات اور معاشرتی موضوعات ہیں۔''

(بحوالہ۔پیش لفظ مجموعہ ''لہو کے پھول'')

اور بقول پروفیسر لطف الرحمٰن :-

''شکیلہ اختر کے اسلوب میں سادگی اور بے ساختگی کا جمال ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کا جتنا کامیاب اور نادر تجزیہ کیا ہے وہ ان کا اپنا حصہ ہے۔ان کے افسانوں میں عورت اپنے تمام روپ میں کھل کر سامنے آتی ہے۔بچپن سے لے کر جوانی اور اس کے بعد کی منزلوں میں عورت کی نفسیاتی تبدیلیوں کا مکمل شعور ان کے یہاں موجود ہے اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے ان سرکش مسائل کو حل کیا ہے۔''

(از مقالہ لطف الرحمٰن ،ساغرِ نو،اختر اورینوی نمبر ،صفحہ ۴۵۱)

پروفیسر وہاب اشرفی نے بہار میں اردو افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے محترمہ شکیلہ اختر کے متعلق فرمایا ہے:-

''شکیلہ اختر کے افسانوں کا پس منظر ہماری روزمرہ زندگی کا نشیب و فراز ہے۔وہ اپنے اردگرد کے حالات و کوائف کی رازداں ہیں اور انہیں بڑے سلیقہ اور فن کاری سے اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ان کے یہاں غایت درجہ کی دروں بینی ہے۔''

درج بالا تمام اقوال کی صداقت کو پرکھنے کے لئے شکیلہ اختر کے افسانوں کا براہ راست مطالعہ ضروری ہے۔محترمہ کی جزئیات نگاری، محاکات پسندی، ماحول سازی اور کردار کے مطابق زبان و بیان کا فطری استعمال یقیناً انہیں ایک ممتاز و معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے روشناس کراتے ہیں۔حسب ضرورت بہار کی دیہاتی اور مقامی بولیوں خصوصاً خواتین کی زبان کا مناسب اور برمحل استعمال وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں جو محترمہ شکیلہ اختر کو ایک کامیاب فن کار اور عصری حقیقت نگار کے طور پر ان کی حیثیت کو مسلم کرتی ہیں۔ وہ بسیار نویس نہیں تھیں کل ملا کر ۷۰۔۷۲ افسانے انہوں نے قلم بند کئے ہیں۔لیکن جتنا کچھ لکھا ہے وہ بے معنی اور بے معیار نہیں ہیں۔اگرچہ خود محترمہ کا اپنی افسانہ نگاری سے متعلق خیال یہ ہے کہ:-

''............میری تمنائیں بس اتنی ہیں کہ لوگ میرے افسانوں کو میرا اپنا لکھا ہوا

سمجھا کریں۔ مجھے اس بات کا بڑا غم ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے افسانے اختر صاحب لکھ دیتے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اختر صاحب کے لکھنے کا انداز مجھ سے بالکل الگ ہے۔ان کے پاس الفاظ کے ذخیرے ہیں اور میرے یہاں تہی دستی، سیدھے سادے الفاظ بس جو دیکھا، محسوس کیا اور اسی کو اپنی گھریلو زبان میں لکھ دیا۔''

شکیلہ اختر کا کمال ہے کہ ان کے افسانے آج بھی قاری کو پسند ہیں، ان کی زندگی کے احوال و کوائف کے ساتھ ان کے دور کے روشن استعارے ہیں۔ان کے دور کے حالات ان افسانوں میں جھلک رہے ہیں۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے شکیلہ اختر کے یہاں رنگا رنگ کیفیات ہیں۔ لیکن فن کی تراش خراش اور اس کے شیوہ ہائے ہزار کے نکتہ نگاہ سے شکیلہ اختر کا فن آج بہت ترقی یافتہ نہیں کہا جائے گا۔ لیکن اپنے زمانے کے لحاظ سے وہ یقیناً بہ نظر احترام دیکھی جائیں گی۔ محترمہ کے بعد افسانوی ادب میں جو نکھار آیا ہے اور بہتر سے بہتر کی تلاش و جستجو شروع ہوئی ہے۔ بلا شبہ آج کے عہد میں اردو کا افسانوی ادب دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ ہے۔

شکیلہ اختر کے معاصرین میں یہ سعادت ممتاز شیریں اور قرۃ العین حیدر کو نصیب ہوئی تھی، ایک ترقی یافتہ آزاد ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان دونوں خواتین کے افسانے فن اور فکر دونوں اعتبار سے خاصے ترقی یافتہ ہیں۔ شکیلہ اختر اپنے عہد کی دیگر خواتین افسانہ نگار صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر اور عصمت چغتائی کے مدمقابل ہیں۔ اعتراف و عقیدت سے آگے فن کا احتساب ہے اور احتساب کرنے کے بعد ہی ہم صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اپنے معاصرین قلم کاروں میں وہ ایک دیو قامت افسانہ نگار اگر نہیں کہلائیں گی تو بونا قد بھی نہیں ہیں۔ اردو افسانوی ادب کے دورِ اولین میں خاص طور سے خواتین افسانہ نگاروں کا جب بھی ہم جائزہ لیں گے تو شکیلہ اختر کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ بہار کے اولین افسانوی ادب میں محترمہ سرفہرست ہیں اور موصوفہ کے بعض نسائی کردار ان کے قارئین کو بہت دیر تک اپنی یاد دلاتے رہیں گے۔ اُن کی تخلیقات میں جو سادگی اور معصومیت ہے، جو سچائی اور دل گدازی ہے، جو Rustic beauty ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ہمارے لئے ادبی جرم ہوگا۔ مستقبل کے نقاد اور نئی نسل کو اپنے اس قیمتی ادبی ورثے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

❋

محترمہ شکیلہ اختر - کچھ یادیں کچھ باتیں

محترمہ شکیلہ اختر، جنہیں ہم لوگ نہایت اپنا پن اور ادب کے ساتھ شکیلہ آپا کہتے تھے۔ دس فروری ۱۹۹۴ء کو ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں، ابھی جناب کلام حیدری اور کیف عظیم آبادی کے غم کو تو ہم بھولے ہی نہ تھے کہ اردو افسانے کا ایک اور اہم نام روپوش ہو گیا۔

غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ استاد محترم ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کی عیادت کے لئے میں پہلی دفعہ ان کی رہائش گاہ چھجو باغ کوارٹر نمبر ۸ میں گئی تھی، اختر صاحب کو بستر علالت پر دیکھ کر بڑا دکھ ہوا تھا۔ وہ سفید چاندنی پر دراز تھے، شکیلہ آپا ان کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں، (یہ تھی ان سے میری پہلی ملاقات) آنکھیں بڑی بڑی خوبصورت اور چمکدار، سانولی رنگت، ترشے ہوئے جدید وضع کے بال، ہر ادا میں نفاست اور خالص مہذبانہ انداز - یہ ملاقات بڑی رسمی سی تھی - پھر دوبارہ بتاریخ گیارہ مارچ ۱۹۸۱ء میں، (تقریباً گیارہ سال بعد، اس وقت اختر صاحب انتقال کر چکے تھے) بہار اردو اکاڈمی پٹنہ کے زیر اہتمام منعقد فکشن سیمینار میں شکیلہ آپا کو ڈائس پر قریب سے دیکھنے اور سننے کا خوشگوار اتفاق ہوا، انہوں نے اپنا افسانہ بعنوان ''سردا گنی'' سنایا تھا۔ سہ روزہ پروگرام تھا۔ لہٰذا کئی اہم ادبی شخصیتوں کو سننے اور دیکھنے کا سنہرا موقع ہمیں نصیب ہوا تھا۔ اس ناچیز نے بھی ایک کہانی ''لمحوں کی صدا'' سنائی تھی اور زندگی میں پہلی دفعہ اپنے قد کو کچھ اونچا ہوتا ہوا محسوس کیا تھا - دوپہر میں خوب بہترین لنچ چلا، شام کی چائے کا انتظام گورنر ہاؤس میں تھا، یہ جلسہ ہند گیر پیمانے پر تھا، خواتین میں عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، شکیلہ اختر، ذکیہ مشہدی، شمیم افزا قمر، شمیم صادقہ، کرشنا پال (مسز جوگندر پال) اور ڈاکٹر محمد حسن کی محترمہ روشن آرا بھی تھیں، قرۃ العین حیدر کے آنے کی شہرت تھی مگر وہ شریک نہ ہو کر ناظرین کو اداس کر گئیں تھیں (بعد میں، میں نے انہیں مہاراشٹر اکاڈمی کے جلسہ میں دیکھنے کا شرف حاصل کیا) مردوں کی فہرست خاصی طویل تھی اس لئے یہاں نہیں دہراؤں گی (آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ عصمت چغتائی اس عمر میں بھی لڑکوں کے گھیرے میں تھیں)۔

شکیلہ آپا کے گرد ہم تمام بہاری خواتین گھیرا ڈالنے کی کوشش کرتے رہے کیوں کہ وہ ہم لوگوں کی نمائندہ تھیں ۔شکیلہ اختر کی حیثیت کئی لحاظ سے ممتاز ہے ۔پہلی بات تو یہ کہ وہ اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار، ناقد، مفکر اور ایک صاحب جمال شخصیت جناب اختر اورینوی کی اہلیہ ہونے کا فخر رکھتی تھیں ،دوسری اہم خوبی یہ کہ وہ خود افسانہ نگار تھیں اور صاحب ذوق بھی ،تیسری خوبی یہ کہ وہ خواتین افسانہ نگار کی اس جماعت سے تعلق رکھتی تھیں جسے اردو افسانے کا ''فلک اول'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ،اس طرح اردو کے افسانوی ادب میں ان کی اہمیت صرف ادبی نہیں ،تاریخی بھی ہے ۔عصمت چغتائی ،صالحہ عابد حسین ،رضیہ سجاد ظہیر ،قرۃ العین حیدر ،رضیہ فصیح احمد ،خدیجہ مستور ،ہاجرہ مسرور ،ممتاز شیریں وغیرہ کے ساتھ شکیلہ اختر کا نام اردو افسانے کی دنیا میں ایک روشن اور تابندہ ستارہ ہے ۔ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور داد شہرت پا چکے ہیں مثلاً مجموعہ ''ڈائن''، ''آگ اور پتھر''، ''لہو کے مول''، ''تنکے کا سہارا''، ''آخری سلام'' وغیرہ ۔ان کے افسانوں کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ عام تھی کہ وہ خود نہیں لکھتی ہیں بلکہ اختر صاحب لکھ دیتے ہیں ۔محترمہ کو اس بات کا بے حد ملال تھا ایک جگہ وہ اپنے اس درد کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں ۔

''......میری تمنا بس اتنی ہے کہ لوگ میرے افسانوں کو میرا اپنا لکھا ہوا سمجھا کریں مجھے اس بات کا غم ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے افسانے اختر صاحب لکھ دیتے ہیں ۔مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اختر صاحب کے لکھنے کا انداز مجھ سے بالکل الگ ہے ۔ان کے پاس الفاظ کے ذخیرے ہیں اور میرے یہاں تہی دستی، سیدھے سادے الفاظ ،بس جو دیکھا ،محسوس کیا اور اسی کو اپنی گھریلو زبان میں لکھ دیا.....!''

(اختر اورینوی نمبر ـ صفحہ ۴۴۶ تا ۴۴۷)

شکیلہ اختر کی اس مختصر سی عبارت سے ان کے قاری کے سامنے بیک وقت کئی نکتے روشن ہوتے ہیں ۔ایک طرف تو یہ حقیقت کہ واقعی اختر صاحب اور شکیلہ اختر کے درمیان نمایاں فرق ہے، شخصی اعتبار سے بھی اور ادبی لحاظ سے بھی ....،اشتراک اسی حد تک تھا کہ دونوں کا شغل افسانہ نگاری تھا مگر انداز و اسلوب بالکل مختلف ۔اختر اورینوی کی شخصیت مرعوب کرنے والی تھی اور شکیلہ صرف متاثر کر سکتی تھیں ، وہ اختر صاحب کے مقابلے میں خود کو ہمیشہ کمتر سمجھتی رہیں اور یہی احساسِ کمتری کبھی کبھی انہیں اختر صاحب سے

جھگڑنے پر بھی اکساتا رہا دوسری بات جو واقعی ان کی ہر تحریر کو پڑھ کر محسوس کی جاتی ہے، خواہ وہ افسانہ ہو، ناولٹ ہو یا تاثراتی مضمون، وہ یہ کہ وہ جو کچھ دیکھتی تھیں محسوس کرتی تھیں، انہیں گھریلو زبان مگر ادبی زبان میں پیش کر دیتی تھیں۔ ان کی تحریر کا یہ حسن ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور مقامی خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ دلّی کی ٹھیٹ اردو آپ کو ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں ملتی ہے تو شکیلہ اختر کے افسانے بہار کی روز مرہ گفتگو، بیگماتی زبان اور محاورے کا لطف دیتے ہیں۔ ان کے دیہاتی کرداروں کے مکالمے اس دشت میں ان کی مشاقی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے لئے کہانی ڈائن کی وہ کالی بھجھوت، ڈائن صفت مچھوائن کو ایک نظر دیکھئے اور اس کی زبان سنیئے۔ کس قدر فطری بیان ہے، جزئیات نگاری اور تصویر کشی کا ایسا کمال ہے کہ خیال عین حقیقت بن جاتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:-

> ''.....اس کے سیاہ چہرے پر لال رنگ کے دھبے دار ہونٹ مکروہ طور پر اور پھیل گئے، میلے کپڑوں میں پلپلاتے ہوئے سیاہ چمڑوں کی گٹھری کھسکتی کھسکتی روشنی کے ذرا نزدیک پہنچ گئی اور تینوں بہنوں نے سڑی مچھلی کے بساند سے بدحواس ہو کر اپنی اپنی ناکوں پر چپکے سے انگلیاں، اخبار اور آنچل رکھ لئے .....اور بڑھیا کا وہی بھیانک منھ ایک بار پھر کھل گیا۔'' کا؟ مالکن کے ہاتھ کا باکی؟'' اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے روشنی کے پلنگ پر بڑے احترام سے پیسہ رکھ دیا۔'' نہ بیٹی نہ۔ ہائے اب تو دوسر کے ہاتھ سے ان کر، باکی پیسہ نہ تو لیب اور نہ لیوے دیب۔ ہائے ہمر مالکینی تو ہمر مائی باپ تھے...'' بڑھیا کا منھ بے کسانہ طور پر پھٹ گیا اور اس کے سیاہ چہرے کی جُھرّیوں میں پچپچاتے ہوئے آنسو پھیل گئے بڑھیا اپنی لال لال آنکھوں سے گھور کر اپنی دیورانی کی حریص نظروں کو دیکھا۔ جو ایک ٹک سے پلنگ پر دھرے ہوئے پیسوں کو تک رہی تھی۔'' ای سوا گو روپیہ سے دن نہ کٹ جائی۔'' اس نے اپنی دیورانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ گھر کے لوگوں نے ہزار جتن کئے کہ وہ کسی طرح سے پیسے لے لے مگر بڑھیا کسی طرح سے بھی پیسہ چھونے کی روادار نہ ہوئی اور جس طرح سے وہ ڈگمگاتی ہوئی خالی ہاتھ آئی تھی اسی طرح سے بائیں پہلو پر جھکی لاٹھی کے سہارے چلتی ہوئی وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ گھر کے

سارے لوگ اسے حیرت سے دیکھتے رہے ''پگلی ہے سالی پگلی'' فیضو نے قہقہہ لگایا
۔مگر جوہیا اس کے جاتے ہی کھل کر ذرا زور سے بولی ''ڈائین تھی جی اللہ قسم! پکی
ڈائین۔''

(افسانوی مجموعہ۔ڈائین از شکیلہ اختر صفحہ ۱۴/۱۵)

ان کی پیش نظر کہانی پر ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں مگر ترقی پسندی سے زیادہ حقیقت پسندی کا رنگ گہرا ہے۔کہانی کے اختتام میں اس ڈائین صفت کردار نے جو اخلاقی بلندی اور اپنی طبیعت کے متضاد رخ کو پیش کیا ہے وہ اس افسانے کو غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ واقعی ''ڈائین'' ان کا ایک کامیاب افسانہ ہے جو روز مرّہ کی گھریلو زبان میں ادا ہو کر اپنا لطف بڑھا دیتا ہے۔

شکیلہ اختر کے افسانوں میں موضوعات کافی متنوّع ہیں، یہ سپاٹ اور بے رنگ نہیں، اس میں انہوں نے خون جگر کی شمولیت کی ہے اس لئے بعض کہانیاں یقیناً لاجواب ہیں۔ جیسے آنکھ مچولی، پیاسی نگاہیں، نفرت، دھندلکا، مظلوم، گھر یا ویرانہ، لہو کے مول وغیرہ۔۔ افسانہ آنکھ مچولی کو ان کے قارئین انکی خودنوشت گردانتے ہیں، ممکن ہے ایسا ہی ہو، مگر اس افسانے کا نفسیاتی پہلو اس قدر تیکھا ہے کہ یہ محدود کینوس میں رہتے ہوئے اپنے بیان اور اسلوب کی دل کشی کے باعث غیر معمولی بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی تخلیقی آرٹ کا حسن موضوع سے زیادہ اس کی پیش کش میں ہے۔پیش کش حسین ہے تو ادنیٰ موضوع بھی لازوال بن جاتا ہے اور پیش کش مناسب نہیں تو پھر موضوع اہم ہو کر بھی کوئی تاثر نہیں جگاتا۔ اس بات کی مثال خود شکیلہ اختر کہ اس مضمون سے دی جا سکتی ہے جو اختر اورینوی نمبر میں ''خوش آمدید'' کے عنوان سے انہوں نے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون رپورتاژ کے انداز میں ہے۔جس میں انہوں نے اختر صاحب کی مہمان نوازی کی خوبی کو محور بناتے ہوئے ان کے وسیع تعلقات کو روشن کیا ہے۔ان کے ہندو پاک کے جید، ممتاز علمی اور ادبی دوستوں کی پٹنہ شہر میں آمد اور ان کے چھوٹے سے مکان کے اندر کہکشان ادب نے جو پر بہار جلوے کبھی دکھائے تھے ان تمام یادوں کو وہ جس محاکاتی انداز میں بیان کرتی ہیں وہ واقعی انکی بے مثال تحریر کا نمونہ بن گیا ہے۔

مثال کے طور پر بغیر کسی تخصیص کے ان کے مضمون ''خوش آمدید'' سے کچھ اقتباسات پیش کرتی ہوں:۔

"...اور ہم سحر زدہ سے سنتے رہے اور ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھتے رہے۔ سیاہ چہرہ، چمکتی ہوئی روشن آنکھیں، جن میں مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں، بولتے، ہنستے مسکراتے ہوئے پان سے رنگین لب۔ ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی، چھریرا جسم، جو کبھی آگے اور کبھی پیچھے جھوم رہا تھا، اور ٹوپی کے نیچے سے گردن تک لوٹتے ہوئے سیدھے سے بال۔- سلطانہ بہن جگر کے ہر ایک شعر پر داد دیتی ہوئی لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں، نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی کہ اچانک عزیزہ کو خیال آیا کہ سلطانہ بہن جوان کے گھر مہمان پڑی تھیں، کھانا کھائے بغیر مشاعرہ میں چلی گئی تھیں........"

جگر صاحب کی پیکر تراشی، ان کے عادات واطوار پر انہوں نے قدرِ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے مگر طوالت کے خوف سے میں نے مثال دیتے ہوئے اختصار کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

اب اردو کے مشہور نقاد آل احمد سرور صاحب کے بارے میں تحریر ملاحظہ کیجئے:-

"......سرور صاحب کو میں قریب سے نہ دیکھ سکی تھی، گھر کے اندر اور باہر آتے جاتے کبھی کبھی ان کی ایک آدھ جھلک نظر آ جاتی تھی اور ان ساری جھلکیوں کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ سرورؔ صاحب کا اچھا چھریرا جسم، درمیانہ قد، مسکراتا چہرہ، سفید رنگ، پان کھائے ہوئے لب ہیں اور تیز تیز چلنے کے عادی، اختر صاحب کی اونچی آواز اور بلند قہقہوں میں، میں نے کبھی سرورؔ صاحب کی اونچی آواز نہ سنی، ان کا کوئی لہکتا ہوا قہقہہ مجھے کبھی سنائی نہ دیا۔ جب پہلی بار غالباً ۵۳ یا ۵۴ء میں سرورؔ آئے تھے اور اختر صاحب کے ساتھ یونیورسیٹی چلے گئے تو میں نے بڑے اطمینان سے جا کر اختر صاحب کے کمرے کا جائزہ لیا جہاں سرورؔ صاحب کو ٹھہرایا گیا تھا بہت ہی سادہ سامان تھا، ایک بستر، شیونگ کا ایک بڑا پرانا سیٹ، یوپی کے دو تین اردو، انگریزی اخبار، ایک چھوٹا سا بیگ اور ایک معمولی سا لوہے کا اٹیچی نما بکس جس کا رنگ پرانا ہو کر جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔ یہ تھی سادگی، ایک بڑے مشہور شاعر، نقاد اور پروفیسر کی-" اختر صاحب بیچارے کے لوہے کے بکس کو اب تک ہم لوگ خواہ مخواہ ہی بساطی کا بکس کہتے رہے تھے۔" میں نے اس اکیلے

کمرے میں چپکے سے اپنی ہار مانتے ہوئے سوچا۔ اختر صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بڑے لوگوں کو اپنی چیزوں کا احساس بھی نہیں ہوتا، ان کی نگاہیں بلندیوں اور گہرائیوں پر ہوتی ہیں ان چھوٹی چھوٹی سطحی باتوں کو نہیں دیکھتیں، تو شاید یہی بلند نظری تھی، جب ہی تو اختر صاحب کافی اونچی اڑان پر رہتے ہیں۔ قمیض کے کولر اور کف پر کبھی کبھی چکٹ بھی جم جاتی ہے اور ہفتوں بغیر پولش کے جوتے پیاسے پڑے رہتے ہیں، جب دیکھو الٹا سوئٹر پہنے چلے آرہے ہیں.....''

(اختر اور رینوی نمبر صفحہ ۹۴ ۔ ۹۵)

اردو کے مشہور افسانہ نویس کرشن چندر کو محترمہ کی عبارت میں دیکھئے:۔

''.....عزیزہ کے ڈرائنگ روم میں ہم سب اکٹھے بیٹھے ہوئے بہت سی باتیں کیے چلے جارہے تھے۔ اگرچہ اپنی بچی کی بیماری اور اس کی جدائی سے غمگین تھے مگر چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جیسی میں انکی تصویروں میں دیکھتی آئی تھی، چمکیلی آنکھیں، بہت اونچی پیشانی، چندلاتا ہوا سر، سرخی لیے گورا رنگ، درمیانہ قد، ترشا ہوا چہرہ، بے تکلف، دیکھنے میں بڑے سیدھے سادے اور مخلص نظر آئے، پہلی ملاقات کی کوئی جھجک نہ تھی، شاید اس لئے کہ ادبی رشتے بڑے پرانے اور گہرے ہوتے ہیں۔''

اس طرح محترمہ شکیلہ اختر کا زیر بحث مضمون یادوں کی ایک پھلجھڑی ہے جس کی ہر چنگاری میں آپ کو اردو ادب کا کوئی نہ کوئی نورانی چہرہ پل دو پل کو دیکھنے کو ملے گا۔ ان چہروں میں نواب جعفر علی خاں آثر ہیں، تاباں ہیں، کرشن چندر، جگر مرادآبادی، محمد طفیل، مجاز، جذبی، اشک، احتشام حسین، آل احمد سرور، اجتبیٰ رضوی، اعجاز حسین، عرش ملسیانی، سرلا دیوی، عابد حسین و صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، روش صدیقی، جوش ملیح آبادی وغیرہ وغیرہ---- ہیں ان کے درمیان اختر صاحب اور خود شکیلہ اختر اپنی پوری گھریلو زندگی کے ساتھ، کبھی مسکراتے ہوئے، کبھی جھگڑتے ہوئے، کبھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اور کبھی چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے... خود محترمہ کی تحریر ملاحظہ ہو:

''...... ہندوستان کے اتنے معزز، اتنے مشہور اور اتنے بلند پایہ لوگ ایسے ہی

اچانک طور پر ہریجن کالونی کے سامنے ایک معمولی سے گیٹ پر بڑے احترام کے
ساتھ اتار دیے جاتے تھے، اختر صاحب کا چہرہ خوشی سے کھل پڑتا تھا اور میں شرم
سے کٹی کٹی سی نظر آتی تھی......"

(اختر اور رینوی نمبر صفحہ ۹۴)

پیش نظر مضمون میں وہ اختر صاحب کی سدا بہار شخصیت کے بعض ایسے گوشے نمایاں کرتی ہیں جو کسی دوسرے قلم سے ممکن نہیں تھا ساتھ ہی شکیلہ اختر کی بعض ایسی خوبیاں از خود سامنے آگئیں کہ شاید خود لکھنے والے کو بھی اس کا علم نہ ہوگا۔ مجھے اس طویل مضمون کو پڑھنے کے بعد شدت سے یہ احساس ہوا کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کی سوانح نگار ثابت ہوتیں، ان کے یہاں جزئیات سے جو گہری دلچسپی ہے، سراپا نگاری اور تصویر کشی میں جو کمال حاصل ہے، سادگی اور پرکاری کا جو مناسب امتزاج ہے، ساتھ ہی شخصیت، سیرت اور ماحول و مناظر کی پیش کش کا جو ایک خاص سلیقہ ہے۔ اس نے رواروی میں بھی ان کے خاکوں میں ایک خاص رنگ بھر دیا ہے۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ شکیلہ اختر نے اپنی ادبی شخصیت کے اس کامیاب رخ کو نہیں پہچانا اور خدا کی ودیعت کردہ اس خوبی سے خاطر خواہ فیض نہیں اٹھایا، ان کے ناقدوں نے بھی اس طرف توجہ نہیں دلائی، دراصل ہماری مردہ پرستی کبھی کسی زندہ ادیب کے بھرپور مطالعہ پر اکساتی ہی کب ہے؟ شکیلہ اختر کے ساتھ بھی ہم نے انصاف نہیں کیا۔

شکیلہ اختر کی تحریر میں نسائی خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کے افسانے، ناولٹ، مضامین سب جگہ ان کی اپنی شخصیت کا اثر اس قدر نمایاں ہے کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ واقعی ایک صاحب طرز ادیبہ تھیں۔ وہ بولنے میں گرم گفتار ضرور تھیں مگر ان کا دل شاید آئینہ کی طرح صاف تھا۔ دل کی یہ صفائی ان کی کہانیاں کہتی ہیں....

انہوں نے ایک طویل عمر پائی تھی اور زمانے کے نشیب و فراز کا اچھا خاصہ تجربہ انہیں حاصل تھا۔ بہت دنوں پہلے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بہار کے افسانہ نگاروں پر مشتمل ایک فکشن سیمینار ہوا تھا، بہت سارے افسانہ نگار مدعو تھے، جناب کلام حیدری مرحوم صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے، شکیلہ آپا کی باری جب کہانی سنانے کی آئی تو وہ کہانی کیا تھی خود ان کی آپ بیتی تھی، یہی وجہ تھی کہ کہانی سناتے سناتے وہ اس قدر ہچک ہچک کر رونے لگیں کہ ان کے قارئین کہانی کے الفاظ بھول گئے اور مبہوت

ہو کر دیکھنے لگے۔ آواز دھیمی، درد میں ڈوبی ہوئی تھی، غالباً اس وقت وہ علیل بھی تھیں۔ اس لئے کہانی مجھے بھی پوری طرح سمجھ میں نہ آسکی تھی مگر ایک افسانہ نگار کا اپنے افسانے کا ایک زندہ کردار بن جانا مجھے آج بھی یاد ہے۔

ان کی عمر کا آخری حصہ احساس تنہائی اور محزونیت کا ایسا مرکب تھا کہ جس کو پل پل گزارنا واقعی ایک صبر آزما کام تھا۔ عورت کی شخصیت میں خاوند اور اولاد کی کمی بہت بڑا خلاء پیدا کر دیتی ہے، وہ بھی آخری عمر میں...... کہاں تو وہ رونق بزم اور کہاں ایسی اداسی، ایسا ویرانہ... اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اپنے ملنے جلنے والوں کو زبردستی اپنے قریب کرتی تھیں۔ بھاگل پور غالباً ۸۴،۸۵ء میں تشریف لائی تھیں۔ پروفیسر لطف الرحمن صاحب کے یہاں ان کا قیام تھا... فون پر اطلاع دے کر ایک ایک شناسا چہرے سے انہوں نے ملاقات کی تھی، پٹنہ کی رہائش گاہ کا پتہ دے گئی تھیں کہ جب بھی آؤ تو ضرور ملو، مگر ہائے رے زندگی اور زندگی کی مصروفیتیں کہ کبھی تو وقت کا دریا اس طرح سبک رفتار ہو جاتا ہے کہ گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا اور کبھی ایسا پہاڑ کہ گزرہی نہ پائے۔

ان کی موت کے بعد نہ جانے کیوں دل کے کسی گوشے سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ کاش! ہم لوگوں نے ان کی دل جوئی اور تیمارداری میں تھوڑا حصہ لیا ہوتا تو شاید ان کی زندگی کا کڑا درد کچھ آسان ہو جاتا، مگر وائے محرومی......!

خدا ان کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں انہیں جگہ دے کہ وہ افسانہ نگار تو تھیں ہی، ایک عورت بھی تھیں، وہ عورت جس کے متعلق اردو کے مشہور شاعر علامہ جمیل مظہری نے اپنی مشہور نظم 'عورت' میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ۔

تو ہے معصوم تری ساری ادائیں معصوم
حد تو یہ ہے کہ ہوتی ہے خطائیں معصوم

شکیلہ اختر معصوم ہی نہیں، شاید مظلوم بھی تھیں، اس لئے آیئے ہم سب لوگ ان کے حق میں دعائے خیر کریں۔ خدا مغفرت کرے ع

بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

شکیلہ اختر: اجمالی جائزہ

بہار کی سرزمین کئی لحاظ سے کافی معتبر اور زرخیز رہی ہے۔ معاملہ ادب وشعر کا ہو یا علم وسیاست کا، مذہب وثقافت کا یا آرٹ وصحافت کا، جنگِ آزادی کی تحریک ہو یا قومی یک جہتی کا معاملہ —— بہار نے ہر مقام پر اپنا نام ملک گیر سطح پر ہی نہیں عالمی سطح پر روشن کیا ہے۔ عہدِ قدیم سے لے کر عہدِ حاضر تک بہار کی اپنی ایک سنہری تاریخ (Golden History) ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کامیابی وکامرانی میں بہار کی خواتین نے بھی زمانہ قدیم سے ہی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

شکیلہ اختر کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ ناول کے باب میں محترمہ رشیدۃ النساء کے ناول ''اصلاح النساء'' کو خواتین ناول نگاری میں خشتِ اول کہا جاتا ہے۔ اسی طرح محترمہ شکیلہ اختر بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں سرِ فہرست ہیں۔ رشید جہاں، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر وغیرہ کا شمار ان کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ ۱۹۳۶ء اردو ادب کے کلینڈر پر ایک یادگار تاریخ ہے۔ اس سال اردو کی سب سے عظیم تحریک بنام ''ترقی پسند تحریک'' کی داغ بیل پڑی تھی۔ منشی پریم چند کا آخری افسانہ ''کفن'' سامنے آیا تھا، جسے ایک طویل عرصے تک اردو افسانے کا ماڈل قرار دیا گیا ہے۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۶ء میں ہی شکیلہ اختر کا پہلا افسانہ ''رحمت'' کے عنوان سے ''ادب لطیف'' میں شایع ہوا تھا۔ بعض جگہوں پر ''مدرس'' کا بھی ذکر آیا ہے۔ ویسے ایک بڑے ادبی حلقے میں افسانہ ''رحمت'' کو ہی ان کی پہلی شایع شدہ تخلیقی کاوش کا نام دیا گیا ہے۔

شکیلہ اختر کی پیدائش کے باب میں بھی مختلف تاریخوں کا ذکر آج تک ہو رہا ہے۔ چوں کہ اُن کی تعلیم باضابطہ کسی اسکول یا کالج میں نہیں ہوئی تھی، اس لئے Age Certificate تو تھی نہیں۔ لہذا مختلف انٹرویوز میں خود محترمہ نے یادداشت کے سہارے مختلف بیانات دے کر مغالطہ پیدا کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں جہاں تک میں تحقیق کر سکی ہوں ۱۶/اگست ۱۹۱۶ء ہی صحیح تاریخِ ولادت ہے۔ مقامِ پیدائش اُرول

ہے۔ جو پہلے گیا ضلع میں تھا، اب جہان آباد کا ایک خوبصورت قصبہ ہے جو سون ندی کے کنارے نیچرل مناظر سے آباد ہے۔ شاید اس خوبصورتی اور صحت بخش دیہی فضا کے لئے اختر اورینوی صاحب جو بعد میں شکیلہ اختر کے خاوند بنے، اس وقت وہ ان کی والدہ کے رشتہ کے بھائی تھے، ۱۹۳۱ء میں اپنی علالت میں ارول تشریف لائے تھے اور یہاں کی رومان پرور فضا نے انہیں بہت جلد صحت مند بنادیا تھا اور شاعر وادیب، ساتھ ہی راجا اندر جیسا محبوب نظر بھی۔ خود اختر اورینوی کے افسانہ ''شادی کے تحفے'' اور شکیلہ اختر کی سگی بہن رضیہ رعنؔا (جو ایک زمانہ میں اچھی شاعرہ کی حیثیت سے مشہور تھیں) کے مضمون بعنوان 'اختر اورینوی صاحب' (ساغر نو، اختر اورینوی نمبر-صفحہ ۱۰۳ تا ۱۱۱) میں اس خوبصورت ماحول کی منظر کشی دیکھی جا سکتی ہے۔ شکیلہ اختر کے والد محترم کا اسم گرامی شاہ محمد توحید تھا۔ علم وادب سے انہیں خاصی دلچسپی تھی، زمینداری کیساتھ علم وادب کے بھی زمیندار تھے۔ گھر میں باضابطہ لائبریری آباد تھی۔ جس سے ان کی بیوی بچیوں نے خاصا استفادہ کیا ہے۔ والدہ محترمہ کو بھی اردو فکشن سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ رضیہ رعنؔا لکھتی ہیں کہ:

> ''......یوں تو ہم لوگوں کے گھر میں ادبی ماحول کچھ کچھ قبل ہی سے تھا۔ امی جان کو اچھے ناولوں اور پرچوں، رسالوں سے انتہائی دلچسپی اور شوق تھا۔ باوجود خانہ داری کی بے حد مشغولیت اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے بھی وہ ہر وقت رسالوں میں غرق رہتیں۔......ان کی میز پر رسالوں کا ایک ڈھیر ہوتا۔ 'نیرنگ خیال'، 'نگار'، 'ادبی دنیا'، 'عالمگیر'، 'عصمت'، 'تہذیب' وغیرہ وغیرہ کا ایک لمبا سلسلہ ہر ماہ کی پہلی سے ۲۰/تاریخ تک قائم رہتا اور ان دنوں امی جان بہت خوش نظر آتیں۔''

'ساغرِ نو' صفحہ-۱۰۴

شکیلہ اختر کی کئی بہنیں تھیں جن میں کزن بھی شامل ہیں، ان کے نام اس طرح ہیں۔ زاہدہ تبسم، صوفیہ، نگارؔ، رازؔ، سلطانہ، رضیہ رعنؔا اور سب سے چھوٹی بہن عذرؔا ہیں۔ ان میں بیشتر کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ جیسے نسیمہ سوزؔ شاعری اور افسانے دونوں لکھتی تھیں۔ محترمہ کی دو سگی بہنوں کا نام شاعراتِ اردو میں لیا جاتا ہے۔ ایک رضیہ رعنؔا دوسری صوفیہ فضل جو اخترؔ صاحب کے سگے چھوٹے بھائی فضل احمد (D.I.G. Police) سے بیاہی گئی تھیں جن کی اولادیں اور خود شکیلہ اختر کے بھائی بہن ان کے سونے آنگن میں کبھی

کبھی بہار لے آتی تھیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کوئی نہ کوئی عورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارا خیال ہی نہیں، یقین ہے کہ ہر کامیاب عورت کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی مرد اپنے اندازِ قدر کی نمائش کر رہی جاتا ہے۔ خواہ والد ہوں، بھائی، بیٹا، خاوند یا کوئی قریبی رشتے دار۔ ممتاز شیریں اور محمد شاہین، قرۃ العین حیدر اور نذر سجاد کے ساتھ سجاد حیدر یلدرم، جیلانی بانو، انور معظم، ذکیہ مشہدی و شفیع مشہدی، رضیہ سجاد ظہیر و سجاد ظہیر —— بے شمار اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ کہنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ان خواتین قلمکاروں کے والد یا خاوند نے ان کے ہاتھوں میں قلم تھما کر لکھنا سکھایا ہے۔ لکھنے کا آرٹ تو ایک خداداد وصف ہے۔ البتہ اس وصف و فروغ دینے کے لئے ماحول سازی ایک ضروری چیز ہے۔ مختصر یہ کہ شکیلہ اختر کو بھی چار چاند لگانے میں اختر اورینوی کی عالمانہ شخصیت کا نمایاں رول رہا ہے۔

۱۹۳۳ء کے مئی ۲۴ میں دونوں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے تھے اور بقول پروفیسر سید محمد حسنین مرحوم جو اختر صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔ (سابق صدر شعبۂ اردو، بودھ گیا) شادی نہایت سادگی کے ساتھ ہوئی تھی۔ تاریخ کی تصدیق خود ان کی بہن رضیہ رعنا نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

"......۱۹۳۳ء کی ۲۴رمئی کو اورینوی صاحب کی شادی آپا جان، شکیلہ اختر صاحبہ سے ہوئی۔ اسے کرۂ ارض کا ایک عظیم سانحہ کہیے یا زندگی کی ایک نہایت شبھ گھڑی۔ بہر حال یہ ذرا نازک سا مسئلہ ہے۔ شکیلہ اختر کے نام سے کم از کم ایک دنیا ضرور متعارف ہے۔"

'ساغرِ نو' صفحہ-۱۰۴

ظاہری بات ہے اس ایک دنیا کے تعارف میں خود اختر اورینوی صاحب کی شخصیت بھی شامل رہی ہے۔ اسی لئے اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی زمانے میں کبھی کبھی ان پر اس قسم کی جھنجھلاہٹ بھی غالب ہوئی ہے کہ:۔

"......میری تمنائیں بس اتنی ہیں کہ لوگ میرے افسانوں کو میرا اپنا لکھا ہوا سمجھا کریں، مجھے اس بات کا بڑا غم ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ میرے افسانے اختر صاحب لکھ دیتے ہیں، مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اختر صاحب کے لکھنے کا

انداز مجھ سے بالکل الگ ہے۔''

ساغرِ نو۔صفحہ ۴۴۶

نئی تحقیق نمبر کے ایک خودنوشت مضمون سے شکیلہ اختر صاحبہ کے یہ الفاظ ماخوذ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر صاحب اس قدر مصروف تر آدمی تھے کہ شکیلہ اختر کی کہانیوں کو لکھنا تو کجا، پڑھنا تک ان کے لئے محال رہا ہوگا۔ ایسے میں اس غلط الزام کو شدت سے محسوس کرنا بھی عین فطری تھا۔ ہمارے پیش نظر جنہوں نے بھی ان دونوں کے افسانوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہوگا وہ یقیناً اس امر کا اعتراف کریں گے کہ دونوں کے اسلوب و بیان میں نمایاں فرق ہے۔ محترم اختر اورینوی صاحب کے یہاں مردانہ وقار ہے، بلند آہنگی اور فکر کی گہرائی ہے۔ شکیلہ کے یہاں ایک ایسی نسائیت ہے جس میں معصومیت اور مظلومیت کے انداز جھلکتے ہیں۔ شکیلہ اختر کی کہانیاں ایک ایسی معصوم فضا میں قاری کو لے جاتی ہیں جہاں گھریلو زندگی کی کشاکش ہے۔ دکھیاروں کے دکھ درد، امیری وغریبی کا فرق، بیوگی کا عتاب، اولاد کی تڑپ وغیرہ موضوعات ہیں۔ جو خوبیاں ان کے افسانوں کو زندگی دے رہی ہیں وہ ہے زندگی کی کڑوی کسیلی سچائیاں اور ان کا فطری اظہار۔ بلاشبہ موصوفہ نے حیاتِ نیرنگ ساماں کے مختلف رنگوں کو نہایت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی حسیات اس قدر تیز تھیں کہ بعض ایک دم چھوٹی اور معمولی باتوں کو بھی انہوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ ذیل میں چند مثالیں دی جارہی ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شکیلہ اختر تفصیل، اطناب اور جزئیات نگاری میں کس قدر کمال رکھتی ہیں:

......اُن کے چہرے کی جھریوں میں آنسو پھیل پھیل جاتے، اُن کی بڑی بڑی لمبی سی ٹھنڈی سانس بھرتیں اور ان کی انگلیوں کے درمیان تسبیح کے دانے اور زور زور سے گرنے لگتے۔ کھٹ کھٹ کھٹ......اور شاہدہ عقیق کے زرد دانوں کو تکتی ہوئی سوچتی کہ ان بڑی باجی کی زندگی میں کیا شربت کا گلاس کبھی آیا ہی نہیں تھا؟ اُن کی ان جھکی جھکی آنکھوں میں جنم سے بس وہی چمکیلے کنگرے والی مسجد ہی بسی تھی؟ اور اسی گھڑی ہمیشہ اچانک طور پر شاہدہ کو اپنے بیمار شوہر کا کمزور چہرہ یاد آجاتا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوتی اور اپنے آنگن کے پچھلے دروازہ سے داخل ہوکر دبے پاؤں دریچے سے کمرے میں جھانکتی۔ احسان اپنے پلنگ پر اسی ایک جگہ پر لیٹا رہتا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بے مقصد سامنے دیوار کو تکتی رہتیں اور دنیا بھر کی موٹی موٹی کتابیں

اس کے چاروں طرف پھیلی رہتی تھی۔ سرہانے میز پر رنگ برنگی دوائیں، اسپوٹیم فلاسک، تھرمامیٹر اور گلاس دھرا رہتا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں دو پلنگ بچھنے کے بعد آنے جانے کے لئے بہت تھوڑی سی جگہ بچتی تھی۔ برسات کے پانی سے اندر اور باہر کی دیواریں ایک طرح سے بھیگی تھیں۔ زمین اگرچہ پختہ تھی مگر بے حد مرطوب، باہر ایک پتلا سا برآمدہ تھا اور سامنے جنگلی جامنوں کا گھنا جنگل......

'پیاسی نگاہیں'۔ صفحہ ۸ تا ۹

اب ایک اور تصویر دیکھئے جو ایک دم مختلف ہے:

''ہائے توبہ''! پلنگ پر بیٹھی ہوئی تینوں بہنوں کی نگاہیں ایک ساتھ اوپر اٹھ گئیں۔ جو صبح ہی صبح ایسی مکروہ صورت پر نظر پڑی ہے اب تو اللہ ہی جانے سارا دن کیسا کٹے گا۔ چھوٹی بہن شنّو منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ چکنی سی لاٹھی کے سہارے بائیں پہلو پر جھکی ہوئی ایک بڑھیا عجیب بے ڈھنگی چال چلتی ہوئی برآمدے کے نیچے پائے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ پسینے سے شرابور اور سڑی ہوئی مچھلی کی باس سے بسی ہوئی کسی مریل کُتّے کی طرح وہ منہ پھاڑے ہوئے ہانپنے لگی اور اس طرح سے ہانپتے ہوئے اس کا کالا بھوت چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ 'اصلی کوبرا بوٹ پالش'۔ ''ایمان سے باجی کہئے تو! کہیں پر سے بھی یہ آدمی لگ رہی ہے؟'' اور شنّو گھر کے بچوں کو ڈرانے کے لئے کھوجنے لگی۔ ''ممی نمی کہاں ہو سب؟'' اور ممی نمی جیسے ہی کمرے سے چہکتے ہوئے نکلے تھے کہ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ سنہرے بالوں کے گچھوں میں ان کا سہما ہوا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور وہ چیخنے لگے ''امی بھوت! بھوت......''

'ڈائن'۔ صفحہ ۵

اور بڑھیا کا وہی بھیانک منہ ایک بار پھر کھل گیا۔ 'کا؟ مالکن کے ہاتھ کے باکی' اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے روشنی کے پلنگ پر بڑے احترام سے پیسہ رکھ دیا۔ 'نا بیٹی نا! ہائے اب دوسرے کے ہاتھ سے ان کر با کی پیسہ نا تو

لیب اور نا لیوے دیب۔ ہائے ہم ماکنی تو ہم مائی باپ تھے......!

ایضاً صفحہ ۱۴ تا ۱۵

مناسب اور برمحل زبان کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس غریب اور نادار طبقے کی اخلاقی بلندی کو جس طرح محترمہ نے درشایا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ کردار، مکالمے، قصے، مناظر و ماحول، روزمرہ کے محاورے اور گھریلو آداب زندگی وغیرہ افسانے کے باذوق قاری کے لئے یقیناً لائق توجہ ہی نہیں انبساط و لطف کا سبب بھی ہیں۔ یوں تو ہر قلمکار مظلوم اور کمزور طبقے کے لئے درد رکھتا ہے لیکن شکیلہ کے قلم نے اس درد کو زیادہ بے باک اور نوکیلا بنا کر پیش کیا ہے جو از دل ریزد بر دل خیزد کا سا انداز رکھتا ہے۔ واقعی وہ اپنے اردگرد کے سماج اور عوامی طبقے کے افراد زندگی کی اچھی پرکھ رکھتی تھیں۔ منظر نگاری، ماحول کشی اور جزئیات نگاری میں محترمہ کا جواب نہیں۔ افسانہ 'ڈائن'، 'کیڑے'، 'پیاسی نگاہیں'، 'گھر یا ویرانہ'، 'لجیا'، 'موسی'، 'آنکھ مچولی' وغیرہ مصنفہ کی شاہکار کہانیاں ہیں۔

ان کے مکالموں پر حسب ضرورت بہار کی دیہاتی اور مقامی بولیوں کے اثرات ہیں۔ بڑی سادگی کے ساتھ انہوں نے اپنے عہد کی خواتین کے مسائل اور ان کے حالاتِ زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اُن کے افسانوں میں رومانیت سے زیادہ زندگی کے تلخ حقائق کی پرچھائیاں ہیں۔ ویسے محترمہ کے اسلوب پر کبھی کبھی ایک جذبۂ بے اختیارِ شوق کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے:

> نزہت نے تھکے ہوئے انداز سے قلم رکھ دیا۔ وہ لکھتے لکھتے اُکتا گئی تھی۔ اس نے بڑی تیکھی نگاہوں سے کمرے کو دیکھا۔ رات کی تاریکیوں میں گہرا سکوت ہر طرف چھا گیا تھا۔ اونچے اونچے محرابوں والے دروازے افسردہ انداز میں کھلے ہوئے تھے اور موٹے موٹے پردوں سے چھپی ہوئی نومبر کی سرد اور سمندر کی نمک سے بوجھل ہوا کمرے کے اندر جیسے سسک رہی تھی اور کمرے سے باہر برآمدے اور صحن میں تاروں کے جھنڈ اور ناریل کے درختوں پر ٹھنڈی چاندنی بے ہوش پڑی تھی۔ نزہت نے لیٹے ہی لیٹے اپنے پائنتی سے دوسرا کمبل کھینچا اور اپنے آپ کو اور بھی ٹھیک سے ڈھانک کر اپنے پاس ہی پڑے ہوئے پیڈ کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا۔ اس کی آنکھوں میں دبے ہوئے آنسو

گڑگڑا ب اس کی ہتھیلیوں اور پلکوں پر چمک اُٹھے تھے۔ ابھی ابھی اس نے بڑے
دکھ کے ساتھ اپنا خط ختم کیا تھا۔

'بھٹکی ہوئی منزل۔صفحہ ۱۹۵۔ازمجموعہ' آگ اور پتھر'

فی الحال محترمہ شکیلہ اختر کی ایک ایسی کہانی زیر بحث لانا چاہتی ہوں جس کا مقابلہ ومواز نہ ہم کرشن چندر کی مشہور ومعروف کہانی ''کالو بھنگی'' سے کرسکتے ہیں۔''کالو بھنگی'' جس طرح اردو افسانے کا ایک یادگار کردار ہے اُسی طرح ''موسی'' کو بھی مشہور ومثالی کردار کا مقام ملنا چاہئے تھا مگر افسوس کا یہ مقام ہے کہ ہمارے بیشتر قارئین شکیلہ اختر کی اس کہانی کے نام سے بھی ناآشنا ہیں۔ دراصل عورت کو ہم لوگ دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں مگر پڑھنا نہیں۔ خواتین ادب کا درجہ ومعیار متعین کرنے میں یہی ناواقفیت ہمارے لئے سب سے بڑی دشواری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ترقی یافتہ عہد میں حالات بدل رہے ہیں اور گذشتہ چند سالوں سے تانیثی ادب پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔

افسانہ ''موسی'' اور ''کالو بھنگی'' کے موضوع وماحول میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کردار اس خاص طبقہ سے متعلق ہیں، جنہیں ہم دلت کردار کا نام دیں گے۔ آج دلت ادب چرچے میں ہے، لیکن آج سے تقریباً نصف صدی قبل شکیلہ اختر نے اس موضوع کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے وہ ان کے دور کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے۔ خود محترمہ کی زبانی 'موسی' کی سیرت نگاری کا جائزہ لیجئے:

> ......موسی عام طور پر ساری جمعداروں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کو صفائی کا خبط تھا اوراس کا میاں جب کبھی اس کو چھیڑتا تو اس کو کیبن کا بھوت کہا کرتا تھا اور یہ سچی بات تھی کہ ڈیوٹی ختم کرکے جب موسی اپنے ایک اندھیری کوٹھری والے کوارٹر میں جاتی تو وہاں اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس کا جی تھوڑی دیر ہی میں گھبرا اٹھتا تھا اور وہ وقت سے پہلے ہی اپنا جھاڑو اور صوآب کا مرچھل لئے کہیں پہنچ جاتی تھی اور اسی طرح دن بیتتے گئے۔ لمبے لمبے دن اور پہاڑوں سی راتیں اُڑتے ہوئے گرد وغبار کی طرح مٹتے چلے گئے۔ موسی کا میاں مرگیا۔ بچے اس احاطے میں کھیل کود کر بچوں والے بھی بن گئے۔ مگر کیبن (ہاسپٹل کے) سے موسی کی اپنائیت نہ گئی......

'موسی'۔صفحہ ۸۲ تا ۸۳

بھرپور کہانویت اور قصہ کا فطری اٹھان 'موسیٰ' افسانے کی کامیابی ہے۔ یہاں کہانی گڑھنے کا مصنوعی انداز نہیں ہے بلکہ ایک ایسی آمد ہے جو کہانی کو فطری رنگ و آہنگ عطا کر رہی ہے۔ ماحول و مناظر، طبقاتی شعور کے ساتھ قصہ، کردار، مکالمہ، مقصد و مدعا، زبان و بیان یہ تمام عناصر اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ یہ الگ سے لادے ہوئے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

اپنے کام میں ایسی وفادار اور محنت کش موسیٰ کا انجام ملاحظہ کیجیے:

> ایک دن بخار کی شدت سے وہ بے چین تھی مگر اپنے کام سے غافل نہیں رہی۔ کام کرتے کرتے اسی عالم میں بیس روپے والے ایک کیبن میں گدے دار مسہری پر دراز ہو جاتی ہے۔ آرام ملتے ہی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ اچانک کسی نے زور سے گرجتے ہوئے اُسے مسہری سے کھینچ کر نیچے گرا دیا۔ ''بڑی نواب زادی بنی ہے'' نصیر دربان اندر گھس کر دروازہ کھولتا ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی کئی افراد ہیں۔

ان کے ریمارک کس قدر تیکھے ہیں:

> ......ابھی ہم تم کو ڈسچارج کر دیں گے اور جرمانے میں تمہارے مشاہرے سے بیس روپے کے حساب سے کاٹ لیا جائے گا نہیں تو یہ حرکت سبھی ملازم کرنے لگیں گے اور دیوار سے لگی موسیٰ بڑی خاموشی سے حساب لگا رہی تھی۔ تیس سال تیس دن اور بائیس روپے جس میں سے اگر بیس روپے جرمانے میں چلے گئے تو کتنا بچا؟ دو اور دو ہی روپے میں بھارت کے اندر زندہ رہ کر وہ اپنے نکلے ہوئے چاند کو کبھی چمکتا ہوا بھی دیکھ سکے گی؟

'موسیٰ'-صفحہ ۱۱۸-مجموعہ 'ڈائن'

موسیٰ، کالو بھنگی سے کچھ زیادہ ہی ایماندار، اچھی خدمت گزار تھی۔ اُس کی تمام عمر ہسپتال میں ہر قسم کی غلاظت کو صاف کرنے اور ہاسپٹل کو چمکانے میں گزری تھی مگر وہ خود کس قدر مظلوم ہے۔ سماج کے غیر منصفانہ نظامِ حیات پر یہاں کتنا گہرا طنز ہے، عصرِ حاضر میں دلت کرداروں کی پیش کش کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ شکیلہ اختر نے نصف صدی قبل اپنی اکثر کہانیوں میں اس قسم کے موضوعات اور کرداروں کو داخل کیا ہے۔ وہ موسیٰ کی شکل میں ہوں یا ڈائن کی صورت میں۔ افسانہ 'مظلوم' کی برقع پوش بوڑھی مظلومہ ہوں یا

افسانہ 'تجیا' کی چھوٹی سی میلی کچیلی فراک میں ملبوس، حیران نگاہوں سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر سب کو دیکھتی ہوئی لاوارث بچی تجیا، جس کے تہہ کئے ہوئے بورے (جو سونے کے لئے دیئے گئے تھے) ایک کنارے دھرے تھے اور چھوٹے کمرے کے پختہ فرش پر تجیا کے پیشاب سے بنی ہوئی اُجلی دھاریاں، اس معصوم، بے سہارا بچی کو گھر سے زبردستی نکال دیے جانے کی داستان سنا رہی تھی۔ افسانہ 'کیڑے' کے معصوم بچے بھی جو بھوک کی شدت میں بجبجاتی ہوئی نالی سے دانے نکال نکال کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں یا 'کچے دھاگے' میں 'ڈومنی' کا کردار۔ غرض شکیلہ اختر جنھوں نے نہ تو ترقی پسندی جوائن کی تھی، نہ دنیا دیکھی تھی مگر ایک محدود دائرے میں رہ کر بھی بڑی تیکھی حقیقت نگاری کی ہے۔ اس نوعیت کے مظلوم و معصوم کرداروں سے اپنی بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے اور بلاشبہ ان کی کامیاب تصویر کشی کی۔ انہیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکیلہ اختر کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یا بالائے بام رہ کر کہانی نہیں بنتی تھیں بلکہ عوامی زندگی کی ہلچل میں انہیں زندہ کہانی ملی ہے۔ زبان و اسلوب پر بھی عوامی اور مقامی خصوصیات غالب ہیں۔ بعض کہانیاں تو خود مصنفہ کی اپنی روداد حیات معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً 'آنکھ مچولی'، 'پیاسی نگاہیں'، 'گھر یا ویرانہ'، 'سندور کی ڈبیہ'، 'سرد آگ'، 'تنکے کا سہارا' (ناولٹ) وغیرہ میں ان کے دردِ دل کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

امتیاز فاطمی کے افسانوی مجموعہ ''ڈوبتی شام'' کے پیشِ لفظ میں وہ اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتی ہیں کہ:

> ......سماجی حقیقت نگاری سے اپنی ذات کی پیچیدگیوں کا سرا تلاش کرنے کا کام خواتین افسانہ نگاروں نے بڑی ایمانداری سے کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے کارنامے گراں قدر ہیں اور ان کی تخلیقات عالمی ادب کا ایک حصہ ہیں......

'پیش لفظ' - صفحہ ٦ - 'ڈوبتی شام'

اختر صاحب ان کے محبوبِ نظر تھے۔ شادی بھی پسند کی تھی لیکن شادی کے فوراً بعد اختر صاحب کی مسلسل علالت اور اولاد کے نہ ہونے کا غم یقیناً ان کی زندگی کا بہت بڑا سانحہ تھا۔ 'آنکھ مچولی' بہت اچھی نفسیاتی کہانی ہے اس کو ان کی خودنوشت کی طرح ان کے قارئین پڑھتے ہیں اور پروین کے کردار میں شکیلہ اختر کو محسوس کرتے ہیں۔ فنی و فکری دونوں جہات سے یہ ایک اعلیٰ درجہ کا افسانہ ہے۔ صرف جذباتیت نہیں ہے بلکہ فکر و فن دونوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔ 'انوکھی مسکراہٹ' کی جمنی اور 'آنکھ مچولی' کی پروین دونوں ہی اردو افسانے کے نہ بھولنے والے نفسیاتی کردار ہیں۔ ہمارے پیشِ نگاہ نہ صرف خواتین کے درمیان

بلکہ اردو کی نفسیات کہانیوں میں اس کا شمار ڈاکٹر محسن کی 'انوکھی مسکراہٹ' وغیرہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔

شکیلہ اختر کا تخلیقی سفر ۱۹۳۶ سے ۱۹۸۶ کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔ ان کا انتقال ۱۰ر فروری ۱۹۹۴ کو پٹنہ میں ہوا۔ یعنی کل ملا کر ۷۷ ربرس کی عمر طبعی انہوں نے پائی۔ اس درمیان محترمہ کے چھ افسانوی مجموعے اور ایک ناولٹ منظر عام پر آئے۔ مطبع اور تاریخ اشاعت کے ساتھ نام نیچے درج کیے جا رہے ہیں۔

1- 'درپن' - مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۳۷ء
2- 'آنکھ مچولی' - دانش کدہ، بمبئی، ۱۹۴۰ء
3- 'ڈائن' - مکتبہ ادب، رمنہ روڈ، پٹنہ، ۱۹۵۲ء
4- 'آگ اور پتھر' - رام نرائن لعل بنی پرساد کٹرہ الہ آباد-۲، ۱۹۶۷ء
5- 'لہو کے مول' - بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴، ۱۹۷۶ء
6- 'آخری سلام' - نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۶ء
7- 'تنکے کا سہارا' - (ناولٹ) نصرت پبلشر لکھنو، ۱۹۷۵ء

'تنکے کا سہارا' کو عام طور سے ناولٹ کہا گیا ہے۔ لیکن ان میں شامل تین ناولٹ 'تنکے کا سہارا'، 'سرحدیں' اور 'منزل' صحیح معنی میں تین طویل افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک ایسی طویل بحث ہے جس کا علیحدہ سے ہی ذکر مناسب ہوگا۔ شکیلہ اختر کے کئی افسانے مختلف افسانوی مجموعوں میں کئی بار ایک ہی عنوان سے شامل کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً 'پیاسی نگاہیں'، 'گھر یا ویرانہ'، 'مظلوم'، 'موسی'، 'ایک دن'، مجموعہ 'ڈائن' اور 'آگ اور پتھر' دونوں میں شامل ہیں۔ اس طرح مجموعی تعداد ان کے افسانوں کی بہت زیادہ نہیں ۶۹ یا ۷۰ ہی ہے۔ ('تنکے کا سہارا' میں شامل طویل افسانوں کو چھوڑ کر)۔

'بہار کے اردو لوک گیت' پر بھی موصوفہ نے تحقیقی نوعیت کا کام کیا ہے اور عوام میں بکھرے ہوئے گیتوں کو یکجا کر کے ان کی اشاعت سے بہار کے لوک گیتوں اور ان کے موضوعات، زبان و بیان، خواتین کے کلچر وغیرہ کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ یقینی طور سے یہ اپنے انداز کا ایک اہم کام ہے۔

شاعری سے متعلق مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ لہذا میں بحیثیت شاعرہ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی ہوں۔ بہنوں میں رضیہ رعنا اچھی شاعرہ تھیں۔ صوفیہ فضیل کو بھی ذوق تھا مگر نمونۂ کلام موجود نہیں

ہے۔ ایک بھائی محمد آفتاب کنیڈا میں میڈیکل پیشہ سے وابستہ تھے۔

شکیلہ اختر کی ایک خوبی، جس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں دی گئی ہے، وہ ہے خاکہ نگاری کا فن ——— موصوفہ کا صرف ایک طویل خاکہ بعنوان "خوش آمدید" ——— 'ساغر نو' کے 'اختر اور رینوی نمبر' میں میرے مطالعہ میں آیا ہے۔ اس خاکہ میں محترمہ نے اس خاص عہد کی بازیافت کی ہے جب وہ شادی کے فوراً بعد اختر صاحب کو ملازمت ملتے ہی اروال سے پٹنہ چلی آئی تھیں۔ خاوند کی رفاقت میں زندگی کے روز و شب گزرتے چلے گئے، آرام و آسائش کی تلاش میں کرائے کے متعدد مکانوں اور مقامات کا ذکر جس میں شہر پٹنہ کی جغرافیائی خصوصیات بھی درج ہیں۔ اختر صاحب کے دوست احباب کا ذکر خیر، ان کے بھائی فضل اور اپنے بھائی عزیز کی تعلیمی مشغولیت و عادتیں، سب سے بڑھ کر بزم ادب' پٹنہ کے حوالے سے اردو شعر و ادب کی نامور ہستیوں کی پٹنہ آمد اور خود اختر اور رینوی کے یہاں قیام، طریقۂ مہمان نوازی، مہمانوں کے آداب زندگی، قہقہے، نغموں کی بہار، گویا علم و ادب کی ایک پھلجھڑی سی جل رہی ہے جس کی شعائیں مختلف اور متنوع ہیں مگر بڑے دیدہ زیب ——— بقول شاعر کہ

دن تو آتے ہی گزر جاتے ہیں
یادیں رہ جاتی ہیں ڈسنے کے لئے

شکیلہ اختر کے قلم کی خوبی یہ ہے کہ محترمہ نے درجن بھر سے زائد افراد کو اس مختصر سے خاکے میں چلتے پھرتے ہوئے دکھایا ہے اور کہانی کا مرکزی ہیرو خود اختر صاحب کی انجمن ساز ذات رہی ہے۔ کاش! وہ خاکہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئی ہوتیں تو آج ان کی ادبی شخصیت کا ایک اور بیش قیمت رُخ ہمارے سامنے ہوتا۔ ان کے بیشتر افسانوں میں بھی خاکہ نگاری اور جُزئیات پسندی دونوں کا عمل دخل ہے۔ میں اگر یہ کہوں تو اس میں حیران ہونے کی بات نہیں ہے کہ یہی وہ کمال ہے جو بسا اوقات ان کے افسانوں میں عیب بن گیا ہے۔ افسانے کا فن عام طور سے ایجاز و اختصار کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ چاول پر 'قل ھو اللہ' لکھنے کا آرٹ ہے۔ بے جا تفصیل اور کھینچا تانی یہاں مناسب نہیں ہے۔ فکشن کے بعض ناقدوں نے اس طرف اشارے کیے ہیں جیسے پروفیسر ش۔ اختر اور ڈاکٹر سید احمد قادری وغیرہ نے یہ بتایا ہے کہ ان کی کہانی فنی اعتبار سے کمزور ہے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جس دور میں یہ افسانے قلم بند ہوئے ہیں، تنقید کی کسوٹی بھی اسی عہد کے افسانوی معیار کو ذہن میں رکھ کر بنانی ہوگی۔ عہدِ حاضر کے معیار پر انہیں پرکھنا سخت

ناانصافی ہوگی۔ شکیلہ اختر ہی پر موقوف نہیں ہے، کرشن چندر، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، خود اختر اورینوی کے افسانے آج کے معیار پر پورے نہیں اتریں گے۔ عام طور سے ہر تخلیق اپنے عہد سے وابستہ ہوتی ہے۔ شکیلہ اختر کے افسانے بھی ایک خاص دور کے مسلم سماج کے خواتین کرداروں کو بڑی جرأت و بے باکی سے پیش کرتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ فکشن سے بڑا جھوٹ اور فکشن سے بڑا سچ ادب کی کوئی دوسری صنف نہیں ہے۔ ماہ ستمبر ۱۹۸۴ء میں وہ ہمارے شہر بھاگلپور دو تین دنوں کے لئے تشریف لائی تھیں۔ ان دنوں وہ بہار اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کی رکن تھیں اور اکادمی کے کام کے سلسلے میں ہی پروفیسر لطف الرحمن صاحب کے یہاں قیام پذیر رہیں۔ اختر صاحب کے شاگردان سے مل کر وہ بہت خوش ہوئی تھیں۔ اختر صاحب کے رشتے سے ایک بڑی آبادی انہیں شکیلہ آپا کہتی تھی۔ ان سے ملاقات کر کے احساس ہوا کہ اب وہ مزاجاً بدل چکی ہیں۔ اختر صاحب کی زندگی میں وہ تنہائی پسندی کی خواہاں تھیں مگر اب ملنا جلنا انہیں پسند تھا۔ محترمہ کا ایک وقت بہت شاہانہ انداز میں گزرا تھا۔ اختر صاحب کی خوشنودی کے لئے وہ گھر کی آرائش سے لے کر چمن کی زیبائش تک میں مصروف نظر آتی تھیں۔ مگر اختر صاحب کی طویل علالت جو شروع میں سینی ٹوریم کے ماحول سے انہیں آشنا کرتی ہے، بعد میں پارکنسن (Parkinson) کی بیماری نے بہ اندازِ دیگر انہیں پریشان رکھا۔ چھجو باغ کوارٹر میں نرس موصوف کی تیمارداری کے لئے تھی (غالباً یہ ۷۰-۶۹ کا زمانہ تھا) مگر مریض کی اذیت واقعی صبر آزما تھی۔ پاس رہ کر بھی یہ دوریاں کبھی کبھی بے حد روح فرسا ہو جاتی ہیں۔ اور اس روح فرسا لمحات میں شکیلہ آپا نے خود کو کہانیوں میں گم کر لیا تھا۔ ان کی اکثر کہانیاں ان کی زندگی کے یادگار لمحوں کی بازیافت ہیں۔ 'تنکے کا سہارا'، 'سرداگنی'، 'آنکھ مچولی'، 'بھٹکی ہوئی منزل'، 'پیاسی نگاہیں'، 'گھر یا ویرانہ'، 'سیندور کی ڈبیہ'، 'مظلوم' وغیرہ کے مطالعے میں کہیں قصہ کے درمیان، کہیں مناظر کی پیش کش میں، کہیں کرداروں کی سیرت وصورت میں خود شکیلہ آپا نظارۂ درمیاں کی طرح ہیں۔ زبان و بیان، اسلوب و آہنگ ہر جگہ عکسِ ذات جھلملا رہا ہے۔ خدا بخش لائبریری کے کانفرنس ہال میں ایک بین الاقوامی سمینار کے موقع پر محترمہ اپنی کہانی 'سرداگنی' سنا رہی تھی مگر پوری کہانی وہ نہیں پڑھ سکیں۔ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئیں کہ پہلے اُن کی آواز بھرّائی، پھر آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ یہ مجھ ناچیز کا آنکھوں دیکھا حال ہے جو آج بھی میری یادوں کے نہاں خانے میں محفوظ ہے۔

اختر صاحب کا انتقال ۳۰ / مارچ ۱۹۷۷ء میں ہوا ہے۔ اس کے بعد موصوفہ کی زندگی میں تنہائی عذاب بن گئی۔ اپنے ایک نجی خط میں جو محترمہ نے عظیم اقبال کے نام لکھا ہے، اختر صاحب کی یادوں کا جو کرب ہے وہ ذیل کے سطور میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

......مگر اب میں گھور اندھیرے میں، انجان راہوں میں لڑکھڑاتی جا رہی ہوں، جہاں اختر صاحب کے کہیں نقشِ قدم نہیں ملتے۔ اب تک وہی پیارے نقشِ قدم ہی تو میرے لئے چراغِ راہ تھے۔ منزلوں تک پہنچانے والے روشن ستارے پر ----- اب؟ ----- اب تو کچھ بھی نہ رہا۔ دل جب بری طرح گھبرانے لگتا ہے تو افسانے لکھنے لگتی ہوں......

اور واقعی ان کے افسانے دردِ دل کی پکار ہیں۔ اختر صاحب کے افسانوں اور کہانیوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں: -

''........ان کے پاس الفاظ کے ذخیرے ہیں اور میرے یہاں تہی دستی۔ سیدھے سادے الفاظ، بس جو دیکھا محسوس کیا، اسی کو اپنی گھریلو زبان میں لکھ دیا........''

'ساغرِ نو'۔ صفحہ ۴۷

سچ تو یہ ہے کہ یہی گھریلو زبان فکشن کی اصل زبان ہے اور اسی زبان کی سادگی کا کمال ہے کہ شکیلہ اختر آج بھی اردو افسانے کے قارئین کو پسند ہیں۔

شکیلہ اختر کے نمائندہ نسائی کردار

کردار نگاری ایک فن ہے، فکشن کی کامیابی کا انحصار اچھی کردار نگاری میں مضمر ہے۔ اچھی کردار نگاری کے لئے کردار کے صرف ظاہری خط و خال پر ہی توجہ نہیں دی جاتی ہے بلکہ اس کے اندرون پر بھی نظر رکھنی ہوتی ہے۔ شکیلہ اختر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے پیش کردہ کرداروں کے ظاہر و باطن دونوں پر توجہ دیتی ہیں۔ وہ انسانی نفسیات کی اچھی پارکھ ہیں، خصوصی طور سے خواتین کی نفسیات اور اس کی جبلی خواہشات کی عکاسی انہوں نے اپنے بیشتر افسانوں اور ناولچوں ''ناولٹ'' میں بڑی ہنرمندی سے کی ہے۔ بقول چھوٹی بہن صوفیہ فضل :۔

> ''.....اب تک ان کے جتنے بھی افسانے چھپتے رہے ہیں وہ سارے کردار ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر چکے ہیں۔ ایک آدھ افسانہ جو انہوں نے پلاٹ سوچ کر لکھا بھی تو اس طرح کہ نہ تو قلم ہی چلتا ہے اور نہ کہانی ہی ختم ہوتی ہے۔ درپن، آنکھ مچولی اور ڈائن ان کے تین مجموعے اب تک نکل چکے ہیں اور ان افسانوں کے کیریکٹر سبھی جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں......''

بحوالہ مضمون شکیلہ اختر از صوفیہ فضل، رسالہ نقوش، شخصیات نمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۱۵۶

درج بالا مجموعوں کے بعد ''آگ اور پتھر''، ''لہو کے مول'' اور ''آخری سلام'' کے علاوہ ایک ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' منظر عام پر آئے تھے۔ ان تمام میں شکیلہ اختر اپنی بہترین کردار نگاری کے لئے ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

جب ہم فن کی کسوٹی پر انہیں پرکھتے ہیں تو یہ بات باعثِ فخر ہے کہ شکیلہ اختر کے بیشتر افسانے فکری و فنی دونوں لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ کل ملا کر ۷۰ افسانے ان کے قلم کے نمونے ہیں۔ چند کہانیاں کئی مجموعے میں دہرادی گئی ہیں۔ جیسے ''موسی''، ''ڈائن'' ''مظلوم''، ''گھریا ویرانہ

''وغیرہ۔ شکیلہ اختر نے افسانے کو محض دل بہلانے کا وسیلہ نہیں جانا بلکہ ان کے افسانے اپنے قارئین سے کچھ ایسے سوالات کا جواب چاہتے ہیں جو ازل تا ابد انسانیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ مثال کے لیے مشہور کہانی ''ڈائن'' کا تجزیہ کیجیے —— کس طرح ایک مچھلی بیچنے والی قبیح صورت، بالکل ان پڑھ عورت، طبقۂ اشرافیہ کی تعلیم یافتہ مہذب رئیس زادیوں پر طنز کی انی چبھوتی ہوئی۔ غربت میں بھی اپنی اخلاقی بلندی کو سامنے لاتی ہے اور رئیس زادیوں کو شرمندہ کرتی ہے جو انسانیت کا مطالعہ تو کتابوں میں ضرور کرتی ہیں مگر عملی زندگی میں صفر ہیں۔ صرف ایک مختصر سی عبارت ڈائن افسانہ سے ملاحظہ کیجیے:

''...... نا مئی نا! ہائے اب دوسرے کے ہاتھ سے ان کر با کی پیسہ نا تو لیب اور نا لیو یدیب۔ ہائے ہمر مالکنی تو ہمر مائی باپ تھے......!''

کہانی کا انجام بہت با اثر اور معنی خیز ہے۔ فن اور فکر دونوں اعتبار سے یہ ایک بے مثال کہانی ہے اور ہماری حقیقی زندگی کی سچی تصویر۔ وہ بظاہر ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھیں مگر اپنے وقت کے اہم رجحانات سے بالکل غافل بھی نہیں تھیں۔

دوسرا افسانہ ''آنکھ مچولی'' ہے، جو ایک ماہر نفسیات افسانہ نگار ڈاکٹر محمد محسن کے افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' کے ہم پلّہ ہے۔ بلکہ دلچسپی کے لحاظ سے ''آنکھ مچولی'' کو افسانہ کے قارئین کچھ زیادہ ہی پسند کرتے ہیں۔ ''انوکھی مسکراہٹ'' کی جمنی اور ''آنکھ مچولی'' کی پروین دونوں ہی نسائی سیرت اپنے غیر معمولی نقش و نگار کے ساتھ قاری کے ذہن پر منقش ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیوں یا Abnormality کو جس فنکاری کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ آنکھ مچولی اردو کی نفسیاتی کہانیوں میں ایک خاص مقام کی حامل ہے۔

اسی طرح افسانہ ''موتی'' میں موتی کا کردار بہت دیر تک ہمیں تلملاتا رہتا ہے۔ کرشن چندر کے ''کالو بھنگی'' کی طرح موتی بھی بظاہر بھنگن ہے اور ہاسپٹل کی غلاظت کی صفائی اس کے ذمے ہے۔ وہ اپنی وفاشعاری، جفاکشی اور غیر معمولی پن سے ہمیں متاثر کرتی ہے۔ آج دَلت ادب خوب خوب چرچے میں ہے۔ مگر آج سے تقریباً نصف صدی قبل شکیلہ اختر کے کئی افسانوں میں دَلت کرداروں کا بہت اچھا اور سچا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ شکیلہ اختر کی موتی ہو یا تجیا، افسانہ ''مظلوم'' کی نقاب پوش غریب عورت یا افسانہ ''شاید'' کی 'بھکارن'—— بلاشبہ ان کمزور اور غریب طبقہ کے ساتھ شکیلہ اختر کی ہمدردی اور انسان دوستی

لازوال ہیں۔ اس نوعیت کے تمام افسانے محترمہ کے ترقی پسندانہ شعور کی روشن مثالیں ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ شکیلہ اختر کے افسانے ان کی معاصرین خواتین افسانہ نگاروں سے کسی طرح کم درجہ پر نہیں ہیں ——"پیاسی نگاہیں" کی انوری باجی یا شاہدہ ہوں یا "آگ اور پتھر" کی تاجی، "بھٹکی ہوئی منزل" کی نزہت یا شاہدہ ہو یا افسانہ "لجیا" کی معصوم لاوارث بچی، ناولٹ "تنکے کا سہارا" کی مسز لال ہوں یا "سرحدیں" کی بجن یا "منزل" کی بینی۔ شکیلہ اختر نے ان تمام نسائی کرداروں کی پیش کش میں کسی خاص اہتمام سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اپنے کرداروں کو فطری انداز میں وقت اور حالات کے تناظر میں پروان چڑھایا ہے۔ فی الحال "پیاسی نگاہیں" کو سامنے رکھیے۔ یہ محترمہ کا ایک پسندیدہ افسانہ تھا۔ انگنت نسائی سیرتیں سامنے آتی ہیں اور اس خاص دور کی یاد تازہ کر جاتی ہیں جو شکیلہ اختر کا عہد تھا—— کرداروں میں شاہدہ، سلمیٰ، سائرہ، مسز انور، بوڑھی بی اماں، زینتل بو، انوری باجی اور پر یتما وغیرہ—— مرکزیت انوری باجی کو حاصل ہے۔ وہ ایک جوان لاولد بیوہ ہیں جن کے بارے میں خود ان کی اماں بوڑھی بی کا مکالمہ سنئے:-

"کنواری بیٹی سے بڑھ کر بیوہ بیٹی کی رکھوالی کرنی پڑتی ہے۔ ہائے اپنا نصیب! ہم تو بیاہ دان کے اپنی جان چھٹی کرلیا تھا۔"

آگ اور پتھر"۔ص ۱۳

خود بقول مصنفہ:

"انوری باجی کو دروازے اور دریچوں سے باہر دیکھنے سے روکا جاتا تھا۔ دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ انوری باجی اوپر سے راکھ کا ڈھیر اور اندر سے لپکا ہوا شعلہ ہیں۔ اپنے کو بیچاری لاکھ دبانے کی کوشش کرتیں، پھڑکتے ہوئے لبوں کو دانتوں سے کاٹتیں، آنکھوں پر پانی کی چھینٹیں دے دے کر ٹھنڈا کرتیں مگر چہرے کی تمتماہٹ مشکلوں سے ہی کچھ دیر کے لیے مٹتی تھی۔"

ایضا: صفحہ ۱۴

شکیلہ اختر کے یہاں موضوع کا تنوع ہے۔ گرچہ ان کے موضوعات زیادہ تر گھریلو زندگی سے وابستگی رکھتے ہیں، بیان میں سادگی ہے مگر ایک واضح نقطۂ نظر بھی ہے۔ وہ کمزور اور مظلوم طبقے کی خواتین

کے ساتھ ساتھ شہری لڑکیوں کو بھی سامنے لاتی ہیں لیکن حمایت عام طور سے وہ کمزور طبقے کی ہی کرتی ہیں —— وہ افسانے میں بھاشن نہیں دیتیں، پند و نصائح کے دفتر بھی نہیں کھولتیں، بلکہ کہانی گڑھتی ہیں جو کبھی کبھی ان کی ذاتی زندگی سے بھی وابستہ نظر آتی ہیں اور اپنے اردگرد کے سماج سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ایک دم سے نیچرل فضا اور ماحول میں سانس لے رہی ہوتی ہیں—— فکشن سے زیادہ سچ اور فکشن سے زیادہ جھوٹ کسی اور صنف میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ فکشن اپنے زمانے کی تاریخ ہے۔ تاریخ (History) کو ہم بدل سکتے ہیں، لیکن فکشن میں بدلاؤ ممکن نہیں۔ شکیلہ اختر کے افسانے اپنے عہد کی تاریخ ہیں۔ خاص طور سے مسلم سماج کی خواتین کے طرز زندگی کو انہوں نے بخوبی قلم بند کیا ہے۔ اس سلسلے میں امیر و غریب ہر طبقہ کو محترمہ نے اپنے قلم کے حصار میں لیا ہے اور حقیقت کا بیان ایک دم فطری انداز میں کیا ہے۔ ان کے یہاں رومانیت نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ بعض بعض کہانیاں تو خود ان کی زندگی کا بیانیہ ہیں۔ جیسے آنکھ مچولی، پیاسی آنکھیں، مظلوم، گھر یا ویرانہ وغیرہ۔

مرد کرداروں میں احسان، ڈاکٹر زیدی، ڈاکٹر پنکج وغیرہ کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ نسائی کرداروں میں شاہدہ، مسز انور، نزہت، ریحانہ، تاجی، انوری باجی وغیرہ کئی افسانوں میں چھائی ہوئی ملتی ہیں۔ مقامی اور علاقائی خصوصیات کے لحاظ سے بھی ان کے افسانوں کی ایک منفرد پہچان ہے۔ زبان و بیان میں سادگی اور علاقائی بول چال کا گہرا اثر ہے۔ وہ کردار کے مطابق زبان استعمال کرتی ہیں۔ مصنفہ کو خود بھی اس بات کا احساس تھا، افسانہ ''بھٹکی ہوئی منزل'' میں نزہت شاہدہ سے مخاطب ہے۔ غور فرمایئے۔

> ''تم...... ایم اے کی ڈگری لے چکی ہو---- تمہاری زبان پر بہار کے دیہاتی الفاظ کا بڑا گہرا اثر تھا۔''

علاقائیت کے سرور میں ڈوب کر وہ بہار کے کئی شہروں کا ذکر بڑی سچائی اور سادگی کے ساتھ کر جاتی ہیں۔ پٹنہ، مظفر پور، مونگیر، دربھنگہ اور بھاگل پور—— کسی کسی افسانے کے منظر و پس منظر میں آجاتے ہیں۔ اس طرح بہ نظر غور دیکھا جائے تو شکیلہ اختر ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے فکر و فن کا خوبصورت گلدستہ ہیں۔ مثلاً

> ''پٹنہ کا شہر گنگا کے کنارے نو میل کی لمبائی پر بسا ہوا کالج اور یونیورسیٹی کی بڑی بڑی عمارتیں اور بجلی کی طرح روشنیاں جب گنگا کے اجلے پانی میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں

تو اس وقت پٹنہ کا سارا شہر دریا کے اندر دلہن کی طرح جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔''

ناولٹ منزل سے

شکیلہ اختر اپنے موضوع سے شدید جذباتی لگاؤ رکھتی ہیں اور شخصیت کو موضوع سے اس طرح باندھ دیتی ہیں کہ ان کے افسانوں کا کینوس محدود ہو جاتا ہے لیکن اثر انگیزی کافی بڑھ جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کا کامیاب اور نادر تجزیہ ملتا ہے۔ عہد طفلی سے لے کر جوانی تک اور اس کے بعد کی منزلوں میں عورت کی نفسیاتی تبدیلیوں کا ان کے یہاں مکمل شعور ہے بقول پروفیسر لطف الرحمن :۔

> ''۔۔شکیلہ کی کہانیوں کا ماحول فکر و فلسفہ کی خشک سنجیدگی سے بوجھل اور گراں بار نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے بہت ہی عام اور روزمرہ کے مسائل کو اٹھاتی ہیں اور ان کا تجزیہ و تحلیل کر کے زندگی اور سماج میں اس کے دیرپا اثرات کو واضح کرتی ہیں۔ اس عمل میں بھی ان کے یہاں قصہ پن مجروح نہیں ہوتا بلکہ دلچسپی کے تمام عناصر کے ساتھ کہانی ارتقائی بلندیوں کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔۔''

بحوالہ، ساغر نو صفحہ ۸۱ تا ۱۰۲ ''مضمون اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ از پروفیسر لطف الرحمن''

نہ صرف خواتین افسانہ نگاروں میں ان کا ایک مقام و مرتبہ ہے بلکہ بہ حیثیت مجموعی وہ اپنی ایک پہچان رکھتی ہیں۔ خاص طور سے جو نسائی کردار انہوں نے خلق کئے ہیں وہ لافانی اگر چہ نہ ہوں لیکن یادگار ضرور ہیں۔ ان کرداروں کا تعلق اس خاص دور کے مسلم معاشرے سے ہے جس میں مصنفہ نے زندگی کے روز و شب گزارے تھے۔ آج سے ساٹھ ستر سال قبل ہندوستانی عورتوں کا جو سماجی مقام تھا اس کی بھرپور ترجمانی ان کے افسانوں اور ناولٹ میں ملتے ہیں، بعض کردار تو ایسے ہیں جو ہر عہد میں زندہ اور پائندہ ہیں "آنکھ مچولی کی پروین، ڈائن کی مچھوائن، ''کیڑے'' کے معصوم بچے جو جینے کے لئے نالی کی گندگی سے دانہ چن چن کر کھا رہے ہیں۔ آج بھی اس قسم کے عبرت ناک نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں، امیری اور غریبی کا مسئلہ ہو یا لاولدی کا غم، ذات پات کا بھید بھاؤ ہو یا جھوٹی شان و شوکت کا مظاہرہ، ہمارا سماج آج بھی ان تمام معاملات میں بہت ترقی یافتہ نہیں ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شکیلہ اختر کے بیشتر کردار اچھی کردار نگاری کا نمونہ ہیں، صرف نسائی کردار ہی

نہیں مردوں میں ڈاکٹر زیدی، انور، مناف میاں، مسٹر لال، مولوی ذکی، اسلم خاں، عبدالغفور دادا، خوش بختا بچوں میں لجیا، منو، نمی وغیرہ ایسے کردار ہیں جن میں زندگی کی تلخ سچائیاں اس طرح فطری انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔۔۔

باب انتخاب میں شکیلہ اختر کے تین مشہور افسانے ''آنکھ مچولی''، ''ڈائن''، ''موتی'' کے علاوہ رپوتاژ نما کافی طویل مضمون ''خوش آمدید'' (ساغر نو صفحہ ۸۱ تا ۱۰۲) کی تلخیص کے ساتھ ہی چند متفرقات بھی شامل کئے جارہے ہیں جن سے موصوفہ کے طرز تحریر کے امتیازات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

انتخاب

(شکیلہ اختر)

آنکھ مچولی

وہ بچپن سے بہت شوخ وچنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی، دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے ''ہنستے ہی ہنستے گھر بستے ہیں'' اور جب اس کی زندگی کا دوسرا اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے اور ہنسی کی سریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں ۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی اس لئے وہ رنگ وبو کی طرح ہر محفل پر چھائی رہتی، اس سجی سجائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے اور احاطے میں سائیکلوں کی قطاریں لگ جاتیں لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے ہوئے موٹروں سے وہ اکتا گئی تھی۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اُس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصّوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے یہاں آتیں، کچھ اس کے بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائنگ روم کے پردے کھینچ جاتے۔ برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے پھر اس کے دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے، موٹی موٹی لال پیلی جلدوں کی کتابیں دبائے، کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہو کر پڑھائی شروع ہو جاتی اور کبھی وہ بلے اور گیند لئے ٹینس پلان اُچکنے لگتے اور روز شام ہوتے ہی گیارہ گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے والے آتے رہتے۔ ڈرائنگ روم، برآمدہ اور کبھی کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا۔ پھر تو شاعری اور فنِ شاعری کے جام چھلکتے اور ادب کی باریکیاں بیان ہوتیں۔ فیض کا ذوقِ ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھا۔ جس کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں میں زندگی کی جھانکتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں۔ کبھی زندگی کے اہم اصول اور دنیا کے نظام پر نگاہ دوڑائی جاتی۔ گہرے اور دقیق مسئلوں اور اس کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے، قہقہے گونجتے، ہنسی کی لہریں اُٹھتیں۔ اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے اندر اپنے کو بے تھاہ وسیع خلاء میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک

عرصہ تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو فریب دیتی رہی تھی، دیر دیر تک پردے کے پیچھے کمرے کے دریچے پر بیٹھی ان کی باتیں سنتی، ان کے تماشے دیکھتی اور بیل کے شربت، انڈے کے حلوے، ناشتے اور چائے سے ان کی خاطریں کرتی رہتی تھی۔ پس پردہ اس نے انہی رنگینیوں میں اپنے آپ کو بہلانا چاہا تھا، مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی ہر شاہراہ پر ایک پر رونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا تھا اس کا اپنا کوئی گھر ہوتا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گزار کر اب تھک گئی۔ تاش کے پتے، کیرم کی کھٹا کھٹ اور مونو پلی کی ہار جیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی دیکھ رہی تھی۔ بلّے اور گیند کی ہر ایک ضرب نے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ اور ادب، دنیا اور نظام حیات کے گہرے گہرے تبصروں نے اس کی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں اتنے ہنگاموں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود ایک اجاڑ۔ ویرانہ میں ایک اکیلی ٹھنٹھ درخت تھی۔ اور ڈرائنگ روم کی حسین آرائش سے وہ اکتا گئی تھی۔ اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ دن بھر میں کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہتی تھی مگر ان ساری چیزوں سے اب اس کا دل بھر گیا تھا۔ ایک مدت سے ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں تھیں، آتش دان پر رکھے ہوئے خوبصورت کھلونوں پر مہین مہین گرد دیکھ کر بھی اب وہ بے پرواہ رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سے بے حس پڑی تھیں۔ رنگ برنگ کی چکڑے اور مٹی کی گڑیاں، جن کے کپڑے نمک کی طرح گل کر اب پھٹتے جا رہے تھے اور ان کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا چکڑے کی ایک بے جان گڑیا ہے اس پر بھی ایک جگ بیت گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اس کی روح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ.......... کھرچنیں اس کے دل پڑ گئی تھیں۔ انہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مردنی سی بے حس مسکراہٹ۔ اب تک وہ انجان طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی نقلی کھلونوں، اور مٹی کی بے جان گڑیوں سے مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اس کا جی بے اختیار چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھولتا رہے۔ اس کی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک چیز کو تتر بتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی لمبا بانس لئے ان چمکتی ہوئی ساری نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے

اوراس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ توڑ کر کوئی اس کی نگاہوں سے انہیں دور کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میز اور کرسیاں اوندھی رہتیں اور سنگاردان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے۔ اس صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں میں ریڈیو کے ایریل دیکھتے ہی بیتابانہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک حصے میں وہ رسی کی بھدی بھدی الگنی تانگ کر ان پر ننھے ننھے بے شمار کپڑے پھیلا دے۔ عجیب عجیب طرح سے بے ہنگم کپڑے جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ اس کو اپنی بے کاری کھلتی رہتی۔ سارا کا سارا دن پڑا رہنا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی۔ ایک ہی طرح سے آخر کتنی دیر وہ لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی سطریں جب اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اکیلی اٹھ کر کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی، باورچی خانے کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی، ڈاکیے کی آواز سنتے ہی وہ خود ڈاک لینے چلی جاتی۔ ترکاری والی، دھوبن اور دودھ والیوں سے وہ خواہ مخواہ مہمل باتیں دیر تک کرتی رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی، کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا تھا۔ مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پر کھڑی وہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی!

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو تھے، خوبصورت، نازک سے، خوش نظر اور خوش سلیقہ، ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر کونا گلزارِ جنت بنا رہتا۔ انہیں پھولوں سے فطری طور پر ایک مجنونانہ عشق تھا۔ وہ خود بھی اس شاخ کے ایک شگفتہ پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول تھیں۔ وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے، شگفتہ، خوبصورت، رنگین اور خاموش ---- ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا۔ مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آ گیا تھا تب سے ان کے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ڈبلا پتلا حسین سا بچہ جب غوں غاں کے بعد اپنے کمرے کے دریچے پر کھڑا ہو کر ماں، ماں کہہ کر شور مچانے لگا تو ایک دن پروین اپنے دریچہ سے پکار کر بولی ''گلاب! ماں نہیں امی بولو امی ---'' اور یہ اس کا گلاب نام بھی اسی نے رکھا تھا ننھی ننھی انگلیوں سے دریچہ کے جنگلے کو پکڑے دو ایک روز تک تو چپ چاپ سے وہ پروین کی امی امی کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا اس کے بعد سے دریچہ کے سفید پردے کے اوپر سے اچک اچک کر چیخنے لگا-----

''امی ، امی'' اسے پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلاب اپنا سبق یاد کر رہا ہے مگر جس دن اس نے یہ محسوس کیا کہ سارا دن اور کبھی رات کو بھی امی ، امی کہہ کر وہ خود اسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اس کے دل میں پیدا ہوئی ''امی ، امی'' یہی پیاری سی آواز سننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی ۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی روح میں خلش انگڑائیاں لے چکی تھیں مگر اس آواز نے اسے ہولناک طور پر بیدار کر دیا تھا ۔ یاقوت کی طرح سرخ لب اور چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ ، لپٹ کر کہتا ''امی'' تو وہ اپنے سینے میں اس کے سفید گالوں پر اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھ کر کہتی ''میرا گلاب ، میرا گلاب'' وہ سارے گھر میں ایک تیتری کی طرح دوڑتا رہتا اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کوئی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی بھول جاتی تھیں کہ گلاب کس کا بچہ تھا --- اسی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی روح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا --- !

یک بیک بارہ سال کی طویل مدت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکا یک اس کا دل نئی ، نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا ، رستے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اس کی رگ رگ میں ہلچل مچا دی تھی ۔ اور وہ اپنے خواب وخیال کے حسین تصوارات میں کھوئی ہوئی سی رہنے لگی --- ''امی ، امی کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے کو مچلنے لگتا تو وہ آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی --- '' گلاب ! تم گلاب ہو نا ؟ اور تمہیں ایک ننھا چمیلی کا پھول دوں گی ۔ لو گے نا ؟ --- پھر اس کی نگاہیں چمیلی کے اس حسین سے پھول کے تصویر پر جم جاتیں ۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ ، بڑی ، بڑی معصوم سی آنکھیں ، سر پر اسی کی طرح گھنگریالے بال ، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں ، کبھی ہنستا کبھی بلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسے توتی ہونٹ --- یہ سب کیا ہو رہا تھا ، وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی ، اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسا شاہکار بنا رہی ہے ۔

فیض نے جب یہ خبر سنی ، مسرت سے وہ جھوم گیا ، پھر اس کی بڑی ، بڑی خاطریں ہونے لگیں ۔ اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ ، سُرخ شاداب امریکن سیب ، خوش رنگ نارنگیاں اور بلور کی طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے فیض حُسن کا پرستار اور شعروادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا ۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار ہوتی ہوئی پروین کی نگاہوں کا پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہو اور انہیں رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ---

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے۔ ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے پڑے ہوئے تھے۔ پیسے میں دو دو ملنے والی ٹھیلے کی مٹھائیاں اور رینگتے بلبلاتے ہوئے بچوں کی اس دنیا میں کمی نہ تھی۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہی تھیں۔ شاید خود عرصہ ہی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے۔ اگر یہ بارہ سال کا ایک جگ نہ بیت جاتا تو چمیلی کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا۔ اسی لئے بے چارہ گلاب چھوٹے چھوٹے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کالے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا۔ گلاب کے لئے صرف پروین کی ایک اکیلی گود ہی پر سکون تھی۔ وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کسی قصور پر بلا کہے سنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونہ میں کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا --- ''امّی امّی اور پروین اپنے سارے کام کو چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی --- پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا --- ''امّی، امّی ہم کو ماں۔ بن بن'' یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پروین کو ایک انتظار تھا۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہتی اور بہت سے خوبصورت نازک سے بچے اس کے پاس چکر لگاتے کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دور، اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے بچے کبھی کبھی اس کی روح سے سرگوشیاں کرتے ''چناپنی پھو'' اسے ٹیگور کی کہانی یاد آ کر ہلا دیتی، پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اس کے بہت سے پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آ رہے تھے۔ ''امّی تا!'' ---!! اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوئی --- ''امّی تا!'' --- ''امّی تا'' --- لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو افسانہ کی وہ بچی یاد آ جاتی جسے تا بولنا نہ آتا تھا اور وہ الماری، شیلف اور کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی ''امّی چیکو'' --- ''امّی چیکو'' اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں سر کو دُھنتی ''امّی چیکو'' --- ''امّی چیکو'' کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کو ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چُھپ گئی تھی۔ اور اب یہی تکلیف دہ آواز پروین کو سنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے۔ زندگی کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی --- وہ کمزور ہوتی

جا رہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی بیتابانہ مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید یہ اس کی روح کا ایک فریب ہو۔ اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی۔۔۔ اس کی مسہری کے چاروں طرف دیواروں میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لاکر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں۔۔۔ کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی پھولے پھولے گالوں والا بچہ مُنہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ، کوئی ہمک ہمک کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے بلا رہا تھا۔ پروین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہوگئی تھی۔ یہ سارے بچے اسی کے تھے۔ صرف اس کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے بلکتے اور ہمکتے ہوئے اتنے سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پروین انہیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جاتی۔ پھولے پھولے گالوں اور بلاتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی ''میرے بچے، میرے لال میں کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھا لوں۔۔۔'' سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتقاماً سوچتی۔۔۔ تمہاری سفیدیاں میرے دل پر چرکے لگاتی رہی ہیں۔ اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے۔ دودھ کی شیشی رہے گی، ہورلکس کی بوتلیں رہیں گی اور دہکتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی۔ وہ اس کوٹھی کا مُنہ چڑا چڑا کر بہت سی الگنی ٹانگے گی اور ان کرسیوں پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کی ترتیب وار سنائگی سے وہ تھک گئی تھی۔ اس لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی روح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی۔۔۔ گلاب بہت زیادہ نزدیک رہ کر اب اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ لہکتا ہوا پھول اس کے تخیل سے بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے، بیٹھے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے۔ کبھی تصویر میں چمبیلی کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے سے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کوئی ''امّی! امّی'' کہتا ہوا اس کے کلیجے سے لپٹ جاتا۔ لیکن کبھی اس ہیبت ناک جھونکے میں اس کا مضطرب دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا۔ ''ہاں''، ''نہیں''! جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر مچپاتی رہتی تھی۔ اور پروین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ''ہاں'' اور ''نہیں'' کے کس کنارے پر

گرے گی۔ کاش یہ مچلتی ہوئی رسّی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ ''نہیں'' سے گزرتی ہوئی بھی ''ہاں'' کے وقتی کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے۔

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی کلی گھوش بابو نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھوش بابو اپنا غصہ برداشت نہ کر سکے وہ زور سے چلائے! ''نکلو یہاں سے'' گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی، ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں مُنہ چھپا کر سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں اور وہ فطرت کی اس غلط تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اسے زور زور سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی۔ گلاب پھر اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ، دوڑ کر چوں چوں کرکے پھدکتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اس نے گوریا کی دُم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کی ہاتھ کے ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس چھن سے گر کر چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ یک بیک اس کے ننھے، ننھے ہاتھ اُوپر اٹھے اور وہ اپنے کان کو پکڑے کونے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا کہ پروین دوڑتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے مُنہ سے نکل گیا۔ ''میرا بچہ! میرا لال!'' پروین کو تو یہ ''چھن'' کی آواز بڑی اچھی لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی۔ گلاب کے لئے اس کے قصور پر پروین کا اتنا بیتابانہ پیار ایک نئی چیز تھی۔ وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید، سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا ''امّی! امّی!''

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہوا بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر لرز جاتا ہے۔ اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی---امیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پرانی مچلتی ہوئی رسّی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ ''ہاں'' ''نہیں'' دونوں کناروں سے اس کی رُوح زور زور سے ٹکرکھا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے سے رسّی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس کی رُوح میں ایک زبردست دھماکا ہوا اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چونے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کر چمک رہی تھیں ہنستی، بلکتی اور ہمکتی ہوئی تصویریں گہری

تاریکیوں میں چُھپتی جارہی تھیں۔ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی ''امّی تا'' اور اس کی دیوانہ وار رُوح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اسے پکڑنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دور ہٹتا جارہا تھا ''امّی تا،امّی تا'' اور پھر ہولناک اندھیرے میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوئی ڈوب کر رہ گئی ---!فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور پروین کے بے بس ہاتھ ''امّی تا'' کی اس آواز کو پکڑ نہ سکے تھے۔وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔''میرے بچے،میرے لال''۔

ڈائن

''ہائے توبہ''! پلنگ پر بیٹھی ہوئی تینوں بہنوں کی نگاہیں ایک ساتھ اُوپر اٹھ گئیں ۔ ''یہ جو صبح ہی صبح ایسی مکروہ صورت پر نظر پڑی ہے تو اب اللہ جانے سارا دن کیسا کٹے گا۔'' چھوٹی بہن شہنو مُنہ ہی مُنہ میں بُد بُدائی۔'' چکنی سی لاٹھی کے سہارے بائیں پہلو پر جھکی ہوئی ایک بڑھیا عجیب بے ڈھنگی چال سے چلتی ہوئی برآمدے کے نیچے پائے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ پسینے سے شرابور اور سڑی ہوئی مچھلی کی باس سے بَسی ہوئی۔ کسی مریل کتّے کی طرح وہ مُنہ پھاڑے ہوئے ہانپنے لگی۔ اور اس طرح سے ہانپتے ہوئے اس کا کالا بھوت چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا-- ''اصلی گو برا بوٹ پالش'' ایمان سے باجی کہئے تو کہیں پرسے بھی یہ آدمی لگ رہی ہے۔''؟ اور شہنو گھر کے بچوں کو ڈرانے کے لئے کھوجنے لگی۔ ''ممی نمی کہاں ہو سب''؟ اور ممی نمی جیسے ہی کمرے سے چہکتے ہوئے نکلے تھے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ سنہرے سنہرے بالوں کے گچھوں میں ان کا سہما ہوا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ اور وہ چیخنے لگے۔ ''امّی ! بھوت، امّی ! بھوت'' اور شہنو کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑا جا رہا تھا۔ مگر یہ تماشا منجھلی بہن روشی کو بے حد خراب لگا۔ بھلا یہ صبح ہی صبح اپنا حسین چہرہ لے کر آ گئی ہے تو اسی کی طرح ہم لوگ بھی بیکار بیٹھے ہوئے ہیں کیا؟ گھر بھر کا ناشتہ اور چائے ویسے پڑا ہوا ہے۔ راج مزدور سب کے سب الگ سر پر سوار ہیں۔ او۔ لو۔ اس پر سے یہ بڑھیا بھی نہ جانے کاہے کو پہنچ گئی ہے۔

''بی بی مچھی کے دام-- دام باکی ہے۔ اُہی لا لائی ہے۔ اِگارہ آنہ پیسہ اور پہلے کا سوا گو رُوپیہ''۔ بڑی مشکل سے مُنہ پھاڑ کے وہ اتنی سی بات بول سکی تھی''۔ کیا؟ پیسہ باقی تیرا- کب کا؟ خانہ داری کے جھنجھٹ سے ایک تو ایسے بھی دماغ خراب ہو رہا ہے اور اس پر سے نہ مچھلی- نہ مچھلی کا دُم۔ اور دے دوان کا گیارہ آنے۔ اور سوا روپے'' روشی غصّے سے جھلّا اُٹھی۔ '' جھوٹی ایک دم سے، گیارہ آنے میں سے آٹھ آنے تو اسی روز دوپہر کو شہلا نے آنچل میں سے کھول کر دیئے تھے تجھے؟ پھر اب تین آنے ہی چاہئے نہ؟ یہ

شکیلہ اختر

گیارہ آنہ پورے کا پورا کہاں سے بن گیا؟ اور جب بڑھیا نے کچھ کہنے کو منہ پھاڑا تو اس کے سیاہ رنگ کے چہرے میں سُرخ زبان، لال لال ہونٹ اور پیلے پیلے دانت جھلک اُٹھے" سوا گوروپیہ! اوتو ہے نا؟ اور تین آنہ اگارہ آنہ میں کے" بولتے وقت اس کی آنکھوں کی پتلیاں بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ روشی نے اپنی گودی کی بچی کو آنچل سے ڈھانپ لیا۔ اللہ کیسے دیدے گھما گھما کر بول رہی ہے۔ ہائے اللہ دے بھی دیجیے نہ۔ بچے سب الگ رو رہے ہیں"۔ برآمدے میں دھلی ہوئی چاندنی کا فرش بچھاتے ہوئے شربتی چھوکری بڑی سرگوشی میں شیریں سے بولی۔" جانتے نہیں ہیں سب ارے یہ ڈائن ہے ڈائن! اللہ قسم پکی ڈائن ہے۔ میرے محلہ میں کوئی بولے ہے اس سے! باپ رے! دیکھتے ہی دیکھتے کلیجہ بھون کے کھا جاہے۔" اور ننھی شیریں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔ ڈائن! ڈائن کون ہوتی ہے؟" اور روشی کو صبح ہی صبح اس سے حساب کتاب کرنا بے حد بُرا لگ رہا تھا۔ بچے سب کمرہ میں گھسے بڑھیا کے ڈر سے اب تک رو رہے تھے۔ شیریں اور روحی اپنی معصوم نگاہوں سے بڑھیا کو گھورتی ہوئی ڈائن کا مطلب سمجھنا چاہتی تھیں۔ اور ناشتہ تھا کہ الگ ٹھنڈا ہوا جا رہا تھا۔ انڈوں کے آملیٹ اور نیم برشت تک تلا چکے تھے اور ایسا ٹھنڈا پالا۔ وہ کوئی گت کا بھی رہا ہوگا۔ شبو نے غرا کر ایک نگاہ ڈالی۔" تو اور رات رہتے کیوں نہ آئی تھی۔ کھانا نہ پینا، لے کے بیٹھے بیٹھے تیرا حساب کرتے رہیں"۔ اور یہ تو نمک حرام ہے۔ شبو بوبو۔ اپنی رعیت ہو کر مالک سے حساب کتاب کرنے آئی ہے۔" کتابن دائی چنے ہوئے دسترخوان پر پنکھا جھلتے ہوئے وہیں پرسے بولی اور بڑھیا مارے غصہ کے بلبلا اُٹھی کہ دیکھو تو اتنا دن جو وہ پیسہ چھوڑے ہوئے تھی تو مالک ہی کا گھر سمجھ کے نا؟ اور اب اس پر سے کوئی نمک حرام بنا رہا ہے اور کوئی کچھ! وہ چمکتی ہوئی سیڑھی پر دھرنا دے کر بیٹھ رہی جیسے آج ستیہ گرہ کے ارادے سے ہی آئی تھی۔ اور بچوں کے آنسو تھے کہ اب تک بہتے ہی جا رہے تھے۔" امّی اب نہ روئیں گے اس کو بھگا دیجیے"۔ اور ممی دونوں کے دونوں سبز رنگ کے کواڑوں کے پیچھے اپنی آنکھوں کو موندے کھڑے چیخ رہے تھے۔" ہاں۔ ہاں رے نمک حرام نہیں تو اور کیا۔ بڑی بچاری! جیسے کھا جائیں گے اس کا پیسہ لے کے! اپنی رعیت ہو کے۔ منہ سے بولی کیسے نکال رہی ہے۔ توبہ! اچھی! لاج بھی نہ لگے۔ بھلا تین آنہ پیسہ بھی کوئی چیز ہے۔" کتابن کی چلتی ہوئی زبان کو روکنا آسان کام نہ تھا، اور بڑھیا سسک سسک کر رونے لگی" ہائے رام۔ ہائے بس تین آنے؟ اور سوا گوروپیہ کدھر گیل۔" اس کے گرد درجن بھر نوکرانیاں جمع ہوگئی تھیں اور دیکھو تو باجی اس کی ناک پر اجلا اجلا سا دانہ جیسا کیا ہے۔ روحی نے بڑے غور سے دیکھتے

ہوئے شیریں کو چپکے سے کہا''۔ارے بھئی۔ یہ کلیجہ بھون کے جو کھاتی ہے۔اسی لیئے ایسا ایسا دانہ نکل آتا ہوگا۔'' شیریں کو شرمتی نے آہستہ سے ٹھوکا دیا۔اجی چپ بھی رہو سن لیگی تو بس شام تک چھٹی ہو جائے گی۔''---؟

اور بڑھیا کا رکا ہوا سیلاب آخر باندھ توڑ کر بہہ نکلا۔کالا چہرہ اور بھی چمک اٹھا۔آنکھوں کی سفیدی بڑھ گئی۔اور ہونٹوں کے پاس پلپلاتے ہوئے گوشت تیزی سے ہلنے لگے اور وہ بکنے لگی کہ۔''تم کھاؤ پیو اور بھرے پیٹ کا ڈکار لے لے کے خوب بولو۔مگر جس کا پیٹ جلے ہے وہی نہ جانے کہ دو دن کے فاقہ کے بعد تین آنہ پیسہ اور اس پر سے سوا روپیہ پہلا باقی کتنی بڑی دولت ہے۔پھر وہ اپنا پیسہ آخر کاہے چھوڑے گی۔وہ اسامی تھی،رعیت تھی تو مالک راجہ ہوکر کیوں نہیں دیکھتے کہ اپنی مچھوائن دو دن سے دانہ کے بنا ترس رہی ہے اور وہ کسی کا بھیک بھی تو نہیں مانگ رہی ہے۔اپنا پیسہ لتا کے بھلا کوئی دیکھ تو لے۔'' وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی اور اس کی یہ بدتمیزی کی بک بک سنتے سنتے تینوں بہنوں کو سچ مچ میں غصہ آنے لگا۔'' سردار! فیضو! سب کے سب کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہو؟ لو یہ تین آنہ پیسہ۔جلدی نکالو اس کو۔روشی دودھ کے دیگچے میں سے ملائی نکالتے نکالتے پیسے پھینک کر بولی۔'' اپنی طرح ہم لوگ کو بھی فقیرنی سمجھے ہوئے ہے۔'' مگر سردار اور فیضو آگے بڑھنے کی بجائے اور بھی پیچھے ہٹ گئے۔''باپ رے۔ڈائن ہے۔ڈائن۔'' اور بڑھیا نے حریصانہ طور سے پیسوں کو سمیٹتے ہوئے گھور کر شہنو کو دیکھا۔'' اور اُو سوا گو روپیہ۔''؟ جوہیا، حسیناں، بدمیاں سب کی سب چھوکری فرشوں، کمروں اور فرنیچروں کو جھاڑتے، پونچھتے چھوڑ چھاڑ کر بڑھیا کے گرد میلا سنا لگا کر کھڑی ہوگئیں۔

اتن بر مالک کے دربار میں جہاں ہاتھی جھولے۔موٹر رہے ہُواں ہم نی بھوک مریں'' بڑھیا فلسفیانہ انداز میں اپنی آنکھوں کو نیم وا کر کے سر ہلاتی ہوئی بڑی حسرت سے بولی۔سالہا سال کے منو من چاول ہمیشہ سے یہی مچھوائن کوٹ چھانٹ کر اپنے ہاتھوں سے زمینداروں کے گھروں میں سینتی رہی تھی۔

اس طرح سے ان لوگوں کی زندگی کے چھ مہینے ذرا کھا کھلا کر چاولوں کی کٹائی پر گزر جاتے تھے۔ پھر جن کے گھروں میں مردوں کی صورت رہتی وہ تو مچھلی وچھلی پکڑ کر آرام سے رہ لیتے۔مگر جس بیچاری کا کوئی نہیں ہوتا اس کو تو کُٹی پر کے چاولوں کے بعد سون کے کنارے ریتوں کے بس ٹیلے ہی نظر آتے۔کبھی کہیں مزدوری مل گئی مگر وہ بھی روز روز کہاں اور کس کو ملتی تھی،نکہت نے شہنو کو ٹھوکا دیا۔''توبہ! غریب ہے

دے بھی دو۔ سمجھو خیرات کر رہے ہیں۔'' ''ہاں خیرات! وہ سمجھے گی بھی کہ خیرات کیا بلا ہے۔ اور یہ شوخی تو دیکھو مانگ کیسے رہی ہے۔ جیسے تمغہ جھنجھار کھا ہوا ہے اس کا۔ سوا گورو پیہ۔ جھوٹی کہیں کی۔ مکار۔'' اور یہ غصہ کی بات بھی تھی کہ نہ تو کوئی ناشتہ کر رہا تھا نہ چائے۔ بیچ میں ایک کالی سی بڑھیا بیٹھ بک بک کر رہی تھی اور ایک تجمیا تھا کہ لگا ہوا تھا۔

اور جو بیا، حسینیاں، بدمیاں چپکے چپکے ڈائن کے قصے دہرا رہی تھیں۔ کلیجہ، دل اور دماغ بس یہی تو کھا کر کے رہتی ہیں سب۔ نانی کہتی تھیں کہ گلشن میاں کا لڑکا امرود کھاتا چلا جا رہا تھا کہ بغیچہ والی ڈائن نے جیسے ہی ٹوکا رو دیا '' کا کھاتے رہے'' ؟ بس وہ لڑکا دیکھتے دیکھتے مرغی کی طرح چھٹ پٹ، چھٹ پٹ کر کے ختم ہو گیا۔'' اور ان کی گروپ میں شربتی ملتی ہوئی بولی۔ بے کارے روشی بوبو، شہنو بوبو اس کے منہ لگ رہی ہیں۔ ارے ابھی کتنا دن ہوا ہے چھ ہی مہینہ نہ کہ اس گھر میں مالکنی بیچاری کے چلے جانے سے کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اور اب جو کچھ ہو ہوا جائے تو اور مصیبت۔ تو بہ سوا روپیہ بھی کوئی دولت ہے۔ ارے ایمان سے۔ تو لوگ انجان ہے میرے محلّے میں سب لوگ اس کے سایا تک سے بچ کے نکلے ہیں۔'' اور یہ سنتے ہی تینوں چھوکریوں کے چہروں پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔'' ہائے رام۔ بڑا دیر ہوئے لا۔ دے دینا ہمرا سوا گو روپیہ۔'' بڑھیا ایک بار جھنجھلا کر زور سے بولی۔'' اب میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ روشی زور سے چیخی ارے بھائی کوئی پوچھے تو اس سے کیسا روپیہ؟ کب کا روپیہ؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی جس کا پیسہ گھٹا اُنچی کوٹھی دیکھ کر پہنچ گئے۔ کب کا باقی ہے؟ کس کے ہاتھ کا باقی ہے کوئی پتہ نہیں۔'' نکہت ہنس پڑی۔'' اللہ توبہ کیسا ہنگامہ مچا رکھا ہے آپ لوگوں نے۔ سوا روپیہ نہ ہوا، دنیا بھر کی دولت ہو گئی، کوئی سنے بھی تو کیا کہے۔ اچھے ہیں اس گھر کے لوگ، لیجیے میں ہی دیے دیتی ہوں۔'' شہنو کے جلے دل کا پھپھولا رستے رستے آخر پھوٹ بہا۔'' رہنے دیجیے اپنا روپیہ۔ سوا روپیہ کا قصہ تھوڑا ہی ہے۔ دیکھ نہیں رہی ہیں کہ کیسی کیسی بدتمیزی کرتی جا رہی ہے یہ بڑھیا، کب اس گھر سے کس کو کیا کچھ نہیں ملا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ بھوکی ہوں، کھانا دو، پیسہ دو۔ مگر جب یہ حساب کرنے پر تلی ہے تو میں بھی حساب کر کے ہی رہوں گی۔ بڑی حساب والی بنتی ہے، تو بتا نہ دے کہ کب کا باقی ہے کس کے ہاتھ میں دیے تھا۔'' مار گھنٹا بھر سے بک بک کیے جا رہی ہے'' روشی چڑ چڑا کر بولی۔'' سوا گو روپیہ مچھلی کے۔'' بڑھیا کا ڈولتا ہوا سر نیچے لٹک گیا اور اس کی مدھم ہوتی ہوئی آواز ایسی لگی جیسے ہوا بھری ہوئی گڑیا میں سے اب ساری ہوا باہر نکلتی جا رہی ہے۔

''ارے یہ سوا روپیہ۔ سوا روپیہ تو چار گھنٹے سے سن رہے ہیں۔ مگر کس کو دیے ہے اور کس کے ہاتھ کا باقی ہے۔'' کتابن کو بڑھیا کی ادھ مچی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے شاید رحم آ گیا تھا۔

''او جو ہمرے دیور کی بیوہ ہے نے! اوہی کے ہاتھ کے باقی ہے۔ اڈیڑھ سیر مچھلی کے دام۔'' بڑھیا رُک رُک کے بولی۔

''اب آئی ہے باتیں بنانے جھوٹی، مکار کہیں کی، جا تو فیضو بلا کے لے تو آ اس کے دیور کی بیوی کو۔'' شہنو اس حسابی بڑھیا کا حساب پورا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اور یہ سنتے ہی بڑھیا سیڑھی کے اوپر پایہ سے لگ کر اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ جیسے وہ آج دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ایک کر کے اٹھے گی۔

گھر کے لوگوں کو بڑھیا کی بک بک سے تھوڑی دیر کے لئے نجات مل گئی تھی۔ سب کے سب دستر خوان پر جھک پڑیں۔ مگر شہنو کا جی ناشتہ کرنے میں نہ لگ رہا تھا اور اس پر سے فیضو کی ماں اور کتابن سلگتی ہوئی آگ پر تیل چھڑک کے جا رہی تھیں۔ ارے یہ بیگم صاحب کے نہ رہنے سے ایسی بدرعی ہے کے۔ اور کیا؟ نہیں تو اتنی مجال تھی کہ مُنہ لگ کے بولتی جائے۔ سب لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مالک تو گھر کے جھنجھٹ میں پڑتے نہیں۔ بھئی سب کو خوب سناؤ۔ ہونہہ۔ روپے ایسے ہی تھا تو مُنہ کھول کے مانگ لیتی کہ جھوکے ہیں کچھ پیسے دے دو، تھوڑا غلہ دے دو۔

اور اب تو میں بھی حساب ہی کر کے دوں گی۔ بدتمیز کتنی ہے۔ بولنے کا شعور تک نہیں ہے۔ اتنا بھی نہیں جانتی کے مالک سے کس طرح بولا جاتا ہے۔ امّی جان کے نہیں رہنے سے جیسے ہم لوگ راہی ہو گئے ہیں۔ شہنو کے زخمی دل پر ایک چوٹ لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

''ہم لوگ کو کبھی ان لوگ سے واسطہ بھی پڑتا تھا؟ امّی جان کے پاس آتی رہتی تھیں سب، مگر اب امّی بیچاری کے بعد نہ جانے کتنے گھروں میں فاقہ ہو رہا ہوگا۔ کیسے کیسے چھپا چھپا کے سب کو دیتی تھیں۔'' نکہت کے آنسو ٹپک پڑے۔

نکہت کو روتا ہوا دیکھ کر روشی نے اپنا پوزیشن صاف کرنا چاہا۔ تو بھئی یہاں لینے دینے کا کچھ قصہ تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اپنے جی سے گڑھا ہوا ہے۔ ایک حساب لئے بیٹھی ہے۔ اچھا تم ہی بتاؤ نہ کب لیا ہے سوا روپے کی مچھلی؟ تم کو یاد ہے؟ پھر یہ فضول سی بات لے کر بیکار میں اتنی دیر سے بک بک کر رہی ہے۔''

چائے پیتے پیتے نکہت اداس ہوگئی۔ ''آج ناشتہ چائے سب کا سب خراب ہوگیا اور اس پر سے جی بھی کیسا لگ رہا ہے کہ سب کوئی تو کھا پی رہے ہیں۔ مگر یہ بیچاری بڑھیا جانے کب سے بھوکی ہوگی اور کیسی لگ رہی ہے۔ جیسے کوئی آدمی نہیں جانور بیٹھا ہوا ہے۔''

''تو وہ جو اپنی بڑھیا بڑھیا ساڑیاں بکسوں میں سینتے ہوئی ہو انہی کے جھنڈے بنا لو اور کہتی پھرو۔ انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔'' شبھو چڑھ کر بولی۔ جلی بھنی شبھو کو نکہت دیر سے چھیڑتی بھی جا رہی تھی۔ ''ایک جھنڈا ہی نکالنے سے بہت بڑا کام ہوتا ہے کیا۔ ارے یہ تو ایک انسانیت ہے۔ آخر ہم بھی تو ویسے ہی آدمی ہیں جیسی یہ بیچاری بڑھیا۔ اور بخالت! دنیا کی بدترین چیز بس اتنا یاد رکھو گی'' نکہت ہنس پڑی۔

''بخالت! بخالت کون کر رہا ہے۔ یہ نہیں دیکھ رہی ہو کہ یہ ڈائن جیسی بڑھیا کتنی دیر سے بدتمیزی کر رہی ہے۔ تم کو کیا ہے۔ تم بیٹھی بیٹھی تماشا دیکھو تماشا۔'' روشی نے شبھو کی پشت پناہی کی۔

چائے ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ فیضو بڑھیا کی دیورانی کو لے کر آ گیا۔ یہ غربت اور بے کسی کی دوسری تصویر تھی۔ تیز آنکھیں مگر روئی روئی سی۔ وہ پرانی مچھوائن تھی اور بچپن کی جانی پہچانی ہوئی۔ بہت ہی چھوٹے سے قد والی بڑھیا مگر تنا ہوا چہرہ۔ کالے چمڑے کے اندر سے زردی پھوٹ رہی تھی اور وہ آ کر سیدھی روشی کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ''بڑا مصیبت ہے بٹی۔ بڑا دکھ، نہ دن چین اور نہ رات چین۔'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نئی مصیبت یہ تھی کہ سون ندی میں سیلاب کا پانی چڑھ گیا تھا۔ سارے لوگ بہہ بہہ کر آتی ہوئی لکڑیوں کو نکال رہے تھے۔ اس کا بیٹا بھی اور ملاحوں کے ساتھ کشتی پر بیچ دھارے میں سے بڑی بڑی قیمتی لکڑیاں پکڑنے کو گیا۔ دو روز قسمت ساتھ دیتی رہی مگر تیسرے روز پانی کے ریلے سے پوری کشتی اُلٹ گئی۔ ایسے سیلاب میں جان کی امید ہی کس کو تھی۔ مگر وہ تو خدا کی مہربانی تھی جو سب کے سب تیراکو تھے جو تیر، تیر کر نکل آئے۔ اور اس کا بیٹا ٹانگ تڑوا کر لایا گیا ہے۔ بیچارے کے گھٹنا کی چکری ہی اپنی جگہ سے ہٹ کر چور چور ہوگئی ہے۔ اور اب نہ دوا ہے اور نہ دارو، گھر میں ایک پیسہ خرچی تک کو بھی نہیں ہے۔ اسی لئے اس نے اپنی جٹھانی کو بھیجا تھا کہ میرے ہاتھ کا باقی سوا روپیہ مانگ کر لا دے۔''

''ہاں ہاں اب پوچھ لا۔ اب پوچھ لا'' مری ہوئی بڑھیا میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس کا کالا

بھوت سارنگ اچانک دمک اٹھا۔ اور وہ اپنی پوری آنکھوں کو کھول کر سب کو گھورنے لگی۔

''باپ رے باپ تو نتیجہ ہو گیل۔ پیسہ توڑا۔ اور اُو کر پھل ملے لا ہمرے۔'' بڑھیا نے دانت پیستے ہوئے اپنی دیورانی کو دیکھا۔

''تو بتا! کب لی گئی تھی تجھ سے مچھلی۔ کس نے لی تھی؟ کتنے دن ہوئے؟ شہنو نے سلجھے ہوئے لہجے میں آہستگی سے پوچھا۔ چھوکریوں اور دائیوں کا ہجوم بڑے انہماک سے فیصلے کا منتظر تھا۔

فیضو اور سردار بھی باہر کا کام چھوڑ کر کھڑے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت کھلائی بوا سالن اور سبزیوں سے بھرا ہوا تھیلا لئے ہوئے بازار سے آئیں۔'' آئیں۔ یہ میلہ کیسا؟ کھلائی بوا ہانپتی ہوئی پاس آ کر بولیں۔'' ارے کا ہو رہا ہے جی؟ کوئی مکدمہ او کدمہ کرے لا آئی ہے کا؟ وہ حیرت سے سب کا منہ تکنے لگی۔ کھلائی بوا اس گھر کی پرانی آدمی تھیں۔ اور گھر میں ان کی عزت اس لئے زیادہ تھی کہ وہ بیگم صاحب کے جہیز میں آئیں تھیں اور سارے بچے ان ہی کے ہاتھوں پلے تھے۔

''نہ بوا۔ کچھو نا۔ اُو ہمر مچھلی کے پیسہ باکی ہے۔'' دوسری مچھوائن نے اپنی تیز نگاہوں سے یہ سمجھ لیا تھا کہ امینٹھی باتوں سے کام نہ چلے گا۔

ہاں کھلائی بوا۔ تم ہی بتاؤ نہ! سوا روپیہ کی ڈیڑھ سیر مچھلی کب لی گئی تھی؟ توبہ چار گھنٹہ سے ناک میں دم آ گیا ہے۔ روشی کا جی اب اس قصہ سے بے حد گھبرا گیا تھا۔

کب، کب لیا گیا ہے؟ میرے تو یاد نہ ہے! کھلائی بوا پایہ سے آڑ لے کر بیٹھی ہوئی بولیں۔ .

اور نکہت نے سوا روپیہ اپنے بیگ سے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیا۔'' لے بھئی لے۔ ختم بھی کر یہ قصہ۔'' اور بڑھیا نے اپنی گھسی کالی کالی دراریں پڑی انگلیوں سے بڑے حریصانہ طور پر پیسوں کو سمیٹ کر مٹھی میں داب لیا۔

''ہاں تو اب بتا نا کس کو دئے تھا مچھلی اور کب دے گئی تھی۔'' شہنو چڑ چڑی آواز میں بولی۔

آٹھ مہینہ ہوا بیٹی۔ پٹنہ جانے سے پہلئے۔ آپن مالکنی کے پاس ڈیڑھ سیر کے مچھلی دے گیلی بل، اُو گھڑی کھلائی بوا بھی رہلن۔'' مچھوائن روتی ہوئی آواز میں بولی۔ ہائے اُو ہی ہاتھ سے پیسو لیتی بل

بھگوان۔" اور سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"امی کے ہاتھ کا باقی تھا؟" شبو اور روشی ایک ساتھ بڑی حسرت سے بولیں۔" اور نجمت کے منہ سے ایک لمبی ٹھنڈی سی سانس بے اختیار نکل گئی۔ کھلائی بوا نے بھی ایک لمبی سی ہنکار بھری۔ "ہاں ہاں میرے ہی سامنے اس اسارے پر تو بائے اس جگہ۔ پر بہو بیچاری نے مچھلی لیا تھا۔" کھلائی بوا نے بچپن، جوانی اور تھوڑے دنوں تک بڑھاپا بھی ساتھ گزارا تھا اور اب اس تنہائی میں ان کے منہ سے بے اختیار آہیں نکل جاتی تھیں۔ گھر بھر پر ایک غمگین تاثر چھایا ہوا تھا۔ اور سب کے چہرے نیچے جھک گئے۔

بڑھیا اپنی جگہ پر اونگھتے اونگھتے گردن ہلا کر ایک بار جیسے چونک پڑی "آمیں! کا؟" اور اس کے سیاہ چہرے پر لال رنگ کے دھبے دار ہونٹ مکروہ طور پر اور پھیل گئے۔ میلے کپڑوں میں پلپلاتے ہوئے سیاہ چمڑوں کی گٹھری کھسکتی کھسکتی روشی کے ذرا نزدیک پہنچ گئی۔ اور تینوں بہنوں نے سڑی مچھلی کی بساند سے بدحواس ہو کر اپنی اپنی ناکوں پر چپکے سے انگلیاں، اخبار اور آنچل رکھ لئے۔

اور بڑھیا کا وہی بھیانک منہ ایک بار پھر کھل گیا۔ "کا؟ مالکن کے ہاتھ کے باکی؟" اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے روشی کے پلنگ پر بڑے احترام سے پیسہ رکھ دیا۔ "نا بٹی نا۔ ہائے اب دوسرے کے ہاتھ سے ان کر باکی پیسہ نا تولیب اور نا لیوے دیب۔ ہائے ہمر مالکنی تو ہمر مائی باپ تھے لا۔" بڑھیا کا منہ بے کسانہ طور پر پھٹ گیا اور اس کے سیاہ چہرے کی جھریوں میں چپچپاتے ہوئے آنسو پھیل گئے۔ بڑھیا نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور کر اپنی دیورانی کی حریص نظروں کو دیکھا۔ جو ایک ٹک سے پلنگ پر دھرے ہوئے پیسوں کو تک رہی تھی۔ "ای سوا گو روپیہ سے دن نا کٹ جائی۔" اس نے اپنی دیورانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ گھر کے لوگوں نے ہزار جتن کئے کہ وہ کسی طرح سے پیسے لے لے۔ مگر بڑھیا کسی طرح سے بھی پیسہ چھونے کی روادار نہ ہوئی۔ اور جس طرح سے وہ ڈگمگاتی ہوئی خالی ہاتھ آئی تھی اسی طرح سے بائیں پہلو پر جھکی لاٹھی کے سہارے چلتی ہوئی وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ گھر کے سارے لوگ اس کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ "پگلی ہے سالی پگلی" فیضو نے قہقہہ لگایا۔ مگر جو ہیا اس کے جاتے ہی کھل کر ذرا زور سے بولی۔ "ڈائن تھی جی اللہ قسم! پکی ڈائن اور روشی نے اپنی گود کی بچی کو چمکارتے ہوئے سوچا۔ کیا وہ سچ مچ میں ڈائن تھی؟ --- ڈائن۔"؟

موسی

بڑے چھوٹے سب کے سب اس کو موسی کہتے۔ سارا کمپاؤنڈ ہی اس کو موسی کہہ کر پکارتا۔ کوئی کبھی اس کا نام نہ جانتا تھا اور اب تو موسی کہلاتے ہوئے اتنا لمبا عرصہ گزر چکا تھا کہ وہ بھی جب اپنے بارے میں سوچتی یا بگڑتی تو خود کو موسی ہی کہتی۔ ''کھا جاؤ۔ سب کے سب موسی کو چیر پھاڑ کر کھا جاؤ'' اور کیبن کے چمکتے ہوئے فرش پر پڑا کے لمبے مرچھل سے سوآب کرتے ہوئے اس کے مرجھائے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسلسل ایک گونج رہتی۔ موسی جنم سے اسی اسپتال میں اپنا کرم چھوڑے کو رہ گئی۔ ہُنہ ہمرے اوپر رعاب۔ ہمرا برابری کون کر سکے ہے؟ جنرل وارڈ کا گوہ موت کرنے والے سب اور میرے مُنہ آویں گے اتنا بڑا ڈاگڈر بھار گو بابو، میجر سرکار بابو، کپتان گھوش بابو اپنا ٹوپ اتار اتار کے ہمرا سلام کریں۔ کہو موسی کیسی ہو۔ کتنے ڈاگڈر بابو کو جُوان سے بُڑھا بنا بنا کے اپنے اپنے رستہ پر لگایا اور ای مونڈی کاٹے ہمرے اوپر رعاب کرے لا آئے ہیں۔'' اتنے مختصر الفاظ میں موسی اپنی ساری ہسٹری کہہ جاتی، اپنی اہمیت جتا دیتی اور کیبن کے ڈولتے ہوئے پردے کے اندر بھی کبھی زور اور کبھی آہستہ سے ایسی بہت سی باتیں پہنچ جاتیں۔ وھیلر کیبن کے خوبصورت اور سجے ہوئے کمرے میں جو مریضہ نئی آتی اس کو آتے ہی موسی کی اہمیت معلوم ہو جاتی اور جو پرانی پیشنٹ آتیں ان کو معلوم ہی رہتا تھا کہ یہ موسی ہے اور کیبن کی کنجیوں کے جھبے نمایاں طور پر اس کے آنچل میں بندھے رہتے ہیں۔ موسی کے گورے اور لمبوترے چہرے پر لمبی لمبی اور ہلکی ہلکی جھریوں کے نشان بڑے اچھے لگتے تھے اور اس کے لمبے اور نوکیلے برابر سے جڑے ہوئے سفید دانت بولنے میں جب بار بار جھلک پڑتے تو سچ مُچ میں موسی کا ایک اثر پڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ہر گھڑی مختلف کیفیتیں ہوتیں۔ محبت، ہمدردی اور خلوص کے ساتھ ساتھ وہ ایسی تادیبی نظر بھی ڈالتی تھی کہ صرف ایک باتھ روم اور اٹیچ کمرے کا روزانہ بیس روپے دیتے ہوئے لوگ بھی تھوڑی دیر کے لئے سٹپٹا جاتے تھے۔ بھلا کیبن میں ایسے بھی کباڑ کھانہ لگے ہے۔ چھی، چھی۔ ہونہہ۔ ایہی کدر ہووے ہے کے نہاوے کے بڑھیا

برھیائپ میں جہاں ٹھنڈا اور گرم پانی کا کل لگا ہے اُوہی میں بچہ کا پھلیا دھولا ہے۔ پہلے کوئی دیکھتا کی ملسن صاحب کی میم اپنی کمرہ کو کیا چمکا کے رکھتی تھی۔۔۔تب ہی نے۔۔۔آجادی کی بات سن کے میم لوگ ہنستی تھیں کہ۔۔۔'' موسی تم الوگ کی اجادی آ رہی ہے۔ اب تو ہندوستانی لوگ ہیاں خوب پان کا پیک چھیکے گا''۔۔۔ہونہہ خالی پانے کا پیک، ارے او کے سے بھی بدتر۔۔۔گووھلائے ہے گوہ۔۔۔نہاوے کے ٹب میں۔ آجادی آئی ہے نہ؟ ایہی میلی میلی گندی گندی آجادی۔ واور ے کیبن۔ پھسکڑ مار کر جمین پر بیٹھو اور کرسی پر پھلیا سوکھے ہے۔'' ایسے وقتوں میں مسہری پر لیٹی ہوئی مریضہ آنکھوں کو بند کر کے سونے کا بہانہ کرنے لگتی اور کمرہ میں زمین پر بیٹھی ہوئی ٹولی گوٹ پیس کھیلتے ہوئے اپنی اپنی پتیوں پر نگاہیں گاڑ لیتی۔ اپنا کام ختم کر کے جب سوآب کا مرچیل یا بلیچنگ پوڈر کا ڈبہ لئے موسی کمرے میں سے باہر نکل جاتی تو پیٹھ پیچھے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے اور جیسے ان کی نگاہیں آپس میں مل کر بڑی خاموشی سے کہہ جاتیں۔'' یار اب کیسا بدلا لیا ہے ہونہہ وھیلر کیبن جیسے ان کے لندن کے باپ ہی کے لئے بنا تھا نہ؟ اور کیبن والوں سے بھی زیادہ غصہ موسی کو سسٹر جوزف پر آیا کرتا۔ کیسا رنگ بدل گئی تھی وہ۔۔۔تھوڑے دن پہلے تک اس کے سفید جوتوں کی ایڑیاں اُٹھتی رہتی تھیں۔ جیسے ہر گھڑی پنجوں پر چلتی رہتی تھی۔ سات بھی بجتے، کہ لال پٹی کس کے راونڈ پر نکل جاتی۔'' ایہہ دیکھو یہ گندا ہے پھیکو جلدی پھیکو جلد صاف کرے بولو'' اور سائیڈ روم اور کیبن میں اتنی شان سے گھستی تھی جیسے کسی نواب کی اکلوتی بیٹی ہی تو ہے۔۔۔اور پھر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جو وہاں بھی رعاب نہ چھانٹتی ہو۔'' دیکھو اس طرح سے کیبن میں نہیں رہتے۔ یہ کیبن ہے ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ پر بجی رہتیں۔ اس پر بھیا گر گلدان ذرا ٹیڑھا رہ گیا تو بس۔ لکچر پہ لکچر۔۔۔اور سارا غصہ موسی پر اترتا۔ تم گندہ ہے موسی تم! نشتر بھری ہنسی موسی کے چہرے پر آتی۔۔۔اور اب جو نو بجے دن کو آ کر کیبن کے اندر اندر یہ میلا میلا لینڈرا گوڈرا دیکھ کے بھی مس جوزف اپنے چہرے پر ایک خوشامدانہ مسکراہٹ پھیلا کر پوچھتی ہے '' سب ٹھیک ہے نہ؟ کچھ چاہئے، تو نہیں؟ بے بی کیسا ہے؟ یا تمہارا ٹائم ابھی باقی ہے۔ ہوگا بے بی ہوگا۔ گھبرائے گا نہیں''۔ ہوں اب تو موسی پوچھے نا کے سسٹر تمہاری آنکھیں کہاں گئیں؟ ڈاکٹر سب جو پہلے تھے وہ اب بھی ہیں وہی گپتا، اوپدھیا۔ سرکار اور لیڈی ڈاکٹر کیا انگلینڈ سے آئی تھیں۔ اب بھی مس جون اور ڈاکٹر کواٹرس ہی ہے۔ پھر وہ پہلے والی صفائی کیا ہوئی اور باہر برآمدے کے چھجے پر کہنیوں کو ٹیکے ہوئے موسی بڑی حقارت سے اپنے سر کو آہستہ سے ہلا کر ظاہراً چپ چاپ سامنے سڑک پر رکشوں، موٹروں اور فنٹنوں کا

ہنگامہ دیکھنے لگتی۔ مگر اس کو بیتا ہوا وقت سب کا سب یاد تھا۔ اسی جون کے ڈر سے پانی یک حلق کے نیچے نہ اترتا تھا اور جو بڑے سے بڑے آفیسر کو جھاڑ کے کہہ دیتی تھی۔۔ ''یہ میٹرنیٹی وارڈ ہے۔ ملنے کے وقت کے بعد کوئی نہیں رہ سکتا تھا۔ بس پیشنٹ اور اٹینڈینٹ۔'' مگر کھدر کی ٹوپی نے اس کا بھی سب نشا بھلا دیا۔ اب تو بارہ بارہ بجے رات تک جنتا اسپتال کے اندر گھومتی رہتی ہے۔ بس دیکھ لو آ کے ننگی ننگی پنڈلیوں اور کشتی نما ٹوپیوں کی بہاریں۔ موسی نہ جانے کیا چاہتی تھی۔ اس کو سور کھانے والے اور شراب پی کر ڈیم فول کہنے والے سے بھی نفرت تھی۔ اور اب ایسے میلے کچیلے سوتنتر بھارت پر بھی غصہ آتا تھا۔۔۔ تین اوپر اور تین نیچے، چھ بہترین کمروں والے کیبن کی وہ جمعدارن تھی۔ جس نے گھونگھٹ کھولتے ہی کیبن کی چمکتی ہوئی زمین دیکھی تھی۔

موسی عام طور پر سبھی جمعدارنوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کو صفائی کا خبط تھا۔۔۔ اور اس کا میاں جب کبھی اس کو چھیڑتا تو اس کو کیبن کا بھوت کہا کرتا تھا۔۔ اور یہ سچی بات تھی کہ ڈیوٹی ختم کر کے جب موسی اپنے ایک اندھیری کوٹھری والے کوائر میں جاتی تو وہاں اِس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس کا جی تھوڑی دیر ہی میں گھبرا اٹھتا اور وہ وقت سے پہلے ہی اپنا جھاڑو اور سوآب کا مچھل لئے کیبن پہنچ جاتی تھی۔ اور اسی طرح دن بیتتے گئے لمبے لمبے دن اور پہاڑوں سی راتیں اڑتے ہوئے گرد غبار کی طرح مٹتی چلی گئیں۔۔۔ موسی کا میاں مرگیا۔ بچے اسی احاطے میں کھیل کود کر بچوں والے بھی بن گئے۔ مگر کیبن سے موسی کی اپنائیت نہ گئی۔ مُنہ دھونے کا بیسن اور نہانے کے ٹب کو بلیچنگ پوڈر سے وہ اس طرح سے رگڑ رگڑ کر ملتی تھی کہ جیسے اس کی چمک کبھی ماند نہ پڑے اور جب تک میموں کا سلسلہ رہا اس کو محنت بھی کم کرنی پڑتی تھی۔ مگر ہائے رام ---وہ سر کو پکڑ کر بیٹھ رہتی۔ ''کیسی آجادی آئی ہے ہاہا۔ نہ تو کھائے کے ڈھنگ نہ رہے ہے کے اور--- اور جو کوئی اس میں بولے تو بس سیدھے منسٹر صاحب کن۔۔ مگر بگڑنے اور غصہ کرنے کے باوجود موسی کا دل بڑا نرم تھا۔ اور اس کی دلی خواہش تھی کہ اس جمعدارن کی طرح دوسرے لوگ بھی صفائی پسند رہیں اور جس کمرے میں بھی موسی کی کوئی پرانی مریضہ آئی، بس وہ خوشی سے کھل اٹھتی۔ بٹی بٹی کہتے اس کا مُنہ سوکھ جاتا اور جہاں ذرا سا بسکٹ کا چور بھی زمین پر گر پڑتا وہ دوڑ کر اس کو بلا کہے سنے صاف کر دیتی۔ اس سے کھل کر باتیں کرتی اور کبھی کبھی ان سے تمباکو، چائے اور پان کے پیسے بھی مانگ لیتی۔ آزادی کے بعد سے کیبن کا کرایہ آٹھ روپے روز سے بڑھ کر یکدم سے بیس روپے روز ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اور لوگوں

کے ساتھ موسیٰ نے بھی دو باتوں میں تبدیلی دیکھی تھی۔ ایک تو یہ کہ کیبن میں پہلے مریضوں کو جو کھانا ملتا تھا ٹھیک اب اس کا آدھا کر دیا گیا تھا۔ چکن پہلے روز ملتا تھا مگر اب ہفتہ میں دو ہی دن دیا جاتا تھا۔ دودھ ڈیڑھ سیر روزانہ کی جگہ بس بارہ چھٹا تک پر ختم کر دیا تھا اور وہ بھی چائے کا حساب لگا کے۔ جہاں درجن بھر پھل ملتے تھے، وہاں بس دو کیلے اور دو گھٹی گھٹی نارنگیاں ملنے لگی تھیں --- اور شام کو سفید تولیوں سے چھپا بڑے ٹھسے سے چائے کا ٹرے آجاتا، جس میں ایک چائے دان میں چائے اور ایک جوڑا پیالی ہوتی، چھوٹی سی ملیا میں چینی اور دودھ دان میں پتلے سے دودھ کے سوا کھانے کو اور کچھ نہ ہوتا، اور چائے کی پتی بھی ایسی کہ اللہ جانے بھارت کی وہ کون سی سرزمین میں اُگائی جاتی تھی جو کسی حال میں بھی چائے کہلانے کی مستحق نہ تھی۔ مگر یہ تو ٹھیک ہے کہ کھایا پیا دیکھتا ہے کون؟ کھانا اگر خراب ہو گیا تھا تو کیا کوئج انڈسٹری جو بہار بھر میں مشہور ہے اس کے موٹے موٹے رنگین پردے تو در میں لٹکائے جا چکے تھے نہ؟ بہترین بیڈ کور تھا جس کے ایک کونا پر ''گیارہ روپے دس آنے'' ابھی تک درج رہ گیا تھا اور اس سے کپڑے کی شان تو بڑھ گئی تھی پھر سنگھار میز اور میلے کپڑے کی الماری اور شیشے کی الماری کے اوپر ایک سیٹ کے کور بچھے ہوئے تھے۔

موسیٰ کو بڑی حیرت تھی کہ کیبن کا کرایہ آٹھ سے بیس روپیہ ہو گیا تب بھی کوئی کمرہ مشکل ہی سے خالی ہوتا تھا۔ ''بس ادھر گئے نہیں کہ کبھی ٹرالی پر اور کبھی ٹہلتی ہوئی مریض پھر آموجود --- ہائے اللہ جیسے اسپتال نہ ہوا آموں کا باغ ہو گیا جو ہر گھڑی پکے پکے آم ٹپکتے چلے آرہے ہیں اور اتنے لمبے چوڑے اسپتال میں جو دن رات بے شمار بچے پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں وہ آخر ہوتے کیا تھے۔ وہ بڑا لیبر روم، جہاں ایک ساتھ تین تین ڈلیوری ہوتی تھی۔ جس کے ساتھ سائڈ لیبر روم بھی تھا جہاں پردے والیاں بھی جا سکتی تھیں مگر اس پر بھی روزانہ کبھی زمین میں بچہ ہو جاتا اور کبھی کسی بیڈ ہی پر --- اور موسیٰ دور سے کھڑی کھڑی یہ تماشا دیکھتی۔ اس کا جی بھی نہ چاہتا تھا کہ کبھی جنرل وارڈ کی طرف دیکھے۔ سارے فیمل وارڈ میں وہ ممتاز حیثیت کی پرانی جمعدارن تھی --- کیبن کے چھ کمروں کے سوا کبھی کسی کا پوٹ صاف نہیں کیا اور ایسے بھی کیبن میں میموں کے بعد آنے والیاں پیسے ہی والی ہوتی تھیں۔ جن کے ساتھ اپنی نوکرانیاں بھی رہتیں۔ صبح آٹھ بجے حاضری کے بعد اپنے دو لمبے برآمدے اور چھ کمروں میں جھاڑو دے کر موسیٰ جب سوآب کرتے ہوئے لمبے لمبے ہاتھ ادھر ادھر پھینکتی تو جھکے جھکے اس کے کمر میں درد ہونے لگتا تھا۔ اپنا کام ختم کر کے جب تک وہ آدھ گھنٹہ بیٹھ نہ لیتی اس کے پیٹ میں سانس نہ سماتا تھا۔ کیبن کے ایک کونے میں وہ اپنا لمبا گلاس

چھپا کر رکھ دیتی اور جب تھوڑی دیر کو آرام کر لینے کے بعد اُٹھتی تو کسی نہ کسی کمرے میں اس کے آنچل میں اسپتال سے آیا ہوا پورے کا پورا ناشتہ اُنڈیل دیا جاتا اور وہ سیڑھی کے ایک کنارے بیٹھی ہوئی چائے میں بچلا بچلا کر توس کھاتی، کیلے کھاتی اور کھٹی نارنگیاں جب اس کو بہت بُری لگتیں تو نیچے احاطے میں کسی آوارہ گرد لونڈے کو پھینک کر دیتی۔ آزادی کے بعد اس کو یہی ایک فائدہ ہوا تھا کہ چھوا چھوت کی وجہ سے اکثر کیبن ہی کے کھانوں سے اس کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ مگر تب بھی اس کے جی پر ایک عجیب تکلیف دہ اثر چھا جاتا، اکتائے اکتائے سے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں ابھرتے رہتے تھے۔۔۔ مہاتما جی، نہرو جی اور بھارت کے سوراج کی بہت سی باتیں اس کے چھوٹے سے محدود دماغ میں چکراتی رہتی تھیں، پہلے تو جہاں اسمتھ اور ویلسن صاحب کے اردلی نے رُعب جمایا موسی پھٹ سے کہہ دیتی۔ ''چار دن کی چاندنی ہے جی، بس چار دن کی۔ پھر اپنا چاند بھی نکلے گا۔ ہم بھی ناچے کودیں گے۔ اور اب چار دن کی چاندنی سچ مچ ختم ہوگئی تھی۔ تو اپنا چاند نکلنے کی دھوم سن کر وہ بھی اچک اچک کر اس چاند کو دیکھنے کو تڑپ رہی تھی مگر چاند نکلنے پر بھی کتنا گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔۔۔ اور موسی بیچاری کا جی اسی تاریکی میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ تو نہانے کے ٹب میں پوتڑے دھوئے جاتے ہیں اور بہترین پولش کی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اس بڑے کمرے میں نہا لیا جاتا ہے۔۔۔ ہائے وہ طلوع ہوتا ہوا چاند کب چمکے گا!؟۔۔۔ جب کیبن کے اندر سے پیتے ہوئے ناریل کی گڑگڑاہٹ مٹ جائے گی جب یا کمرے میں نہائے ہوئے پانی سے جب اس عمارت کی بنیادیں مٹ جائیں گی تب میٹرنیٹی وارڈ میں موت اور زندگی کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ لگاتار نئی نسلیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ کالی، گوری، نکٹی، چپٹی۔۔۔ بس چلی آ رہی ہیں کوئی روک روکاؤ نہیں۔ موسی نے اب تک ہزاروں بچوں کو پیدا ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا اور وہ یہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ جتنے دنیا میں آتے ہیں، اُتنے جاتے نہیں۔ روزانہ درجن بھر سے کم بچے کبھی پیدا نہ ہوئے اور ایسے مہینہ دو مہینہ یا بہت بہت تو ہفتوں بعد کوئی بیچاری اس دنیا سے چلی گئی۔ کیبن میں بھی کئی موتیں ہوئی تھیں۔ لیکن لال لال چہروں والی میموں کے مرنے سے موسی کو وہ دلی تڑپ کبھی محسوس نہ ہوئی تھی جو اب تین نمبر کیبن میں ایس ڈی او صاحب کی بیوی کی اچانک موت سے ہوئی تھی۔ پہلے تو لمبے لمبے سفید چونچ والے پادری آ آ کے عجیب عجیب رسمیں پوری کرتے تھے۔ اب سنکھ کی اپنی پہچانی ہوئی، بھری بھری آواز میں اس کا دل کٹ گیا تھا۔۔۔ مگر ہائے اس بچاری کی جوانی ---لال رنگ کے نئے کپڑوں میں سجا کر جب اس کو رنگ برنگ کے پھولوں سے

ڈھانک دیا گیا تو سوئی ہوئی رانی جیسی لگ رہی تھی۔ گورا چہرا دپ دپ کرر ہا تھا اور اس پر سے پھولوں کی بہار۔۔۔اور جب سنکھ کی آواز کے ساتھ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور آفیسروں نے اس کی آرتھی اپنے ہاتھوں سے نیچے اتاری تو سیڑھیوں تک جا کر موسی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ جاؤ ہو بٹی جاؤ۔ جاؤ۔ خوش رہو۔۔اور پھر اس نے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے آنچل میں پونچھ لیا تھا۔

اس طرف کئی دنوں سے موسی کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ زکام، کھانسی اور جیسے رگ رگ میں کوئی نشتر چبھوئے جا رہا تھا۔ لیٹے رہنے کی شدید تمنا کو دبا کر وہ اس لئے چھٹی نہ لے رہی تھی کہ بائس ۲۲ روپے تنخواہ میں سے کاٹ لئے جائیں گے۔ تیس ۳۰ سال کی بوڑھی پرانی نوکری میں ترقی کے اتنے ہی زینے وہ چڑھ سکی تھی اور اس پر سے ایسی گرانی۔ روپے کا سوا سیر چاول کوئی جنم میں بھی نہ ہوا تھا، کہاں تو دنیا میں آگ لگ رہی ہے، دانہ دانہ کو لوگ ترس رہے ہیں اور اوپر سے لونا روز کے روز درجن بھر بچے۔

جیسے ہی شام کو پانچ نمبر کیبن خالی ہوا اور سسٹر نے حکم چلا دیا کہ موسی جلدی سے کمرہ دھو کر صاف کرے اور دھوئے ہوئے بستر ے لگا کر تالا بند کر دے اور جاتے جاتے یہ نشتر بھی لگا گئی کہ موسی سے اب کام نہیں ہوتا ہے۔ اب اس کو ہٹانا پڑے گا۔ موسی کا جسم چور چور لگ رہا تھا۔ یہ سنتے ہی اس کا جی بھنا اُٹھا ۔۔۔اور وہ بد بدائے بغیر نہ رہ سکی ۔۔۔نگوری کرستانی ۔۔۔ ایسا درد ۔۔۔ایسا تیرے اُٹھتا تب نہ بوجھاتا اور کرستانی کہہ لینے کے بعد اس کو اپنے موسی ہونے پر خوشی ہوئی۔ بڑا رعاب جماتی ہے، جیسے ابھی تک بھیا بند بیٹھے ہوئے ہیں نہ!ہاں ۔۔۔ بھول جاؤ ۔۔۔!اب اپنا راج ہے نا ۔۔۔مگر ساتھ ہی اس کا ہاتھ جھاڑو پر پڑ گیا۔ تیس ۳۰ سال کی اطاعت کو اس کی بغاوت بھلا نہ سکی۔ اس نے بول میں پانی لا لا کر جہاں تک چینی کی تختیاں دیوار میں جڑی ہوئی تھیں اس نے اوپر سے دھونا شروع کیا۔ کواڑ، دریچے، پچھلے طرف کا برآمدہ، پورا کمرہ اور باتھ روم اور جھک کر دھوتے دھوتے جب وہ سیدھی کھڑی ہونے لگی تو اس کی ریڑھ کی ہڈیاں ایک دم سے کڑ کڑا گئیں۔ وہ کمر کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے بھی کسی طرح کھڑی نہ ہو سکی ۔۔۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور ناک سے زکام کا پانی جھر جھر گرنے لگا۔ وہ بلبلا اُٹھی۔ بائس ۲۲ روپیہ پر اتنی کھٹنی۔ بیٹھی بیٹھی کمرے کا سارا پانی سونتھ کر وہ باہر نکل آئی اور آہستہ آہستہ برآمدے کے پایہ سے لگ کر بمشکل وہ اپنے کو سیدھا کر سکی۔ سب سے مصیبت اوپر سے جا کر بستروں کا لانا تھا اور یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ آتے جاتے ہوئے اتنے لوگوں میں نصیر دربان کو دیکھتے ہی موسی کا چہرا کھل گیا، نگاہوں میں دھندلکا

سا چھار رہا تھا مگر بجلی کی روشنی میں وہ اس کو پہچان کر بولی " بابو۔ بیٹا۔ ذرا نرس سے جا کر بستر لا دے" اور نصیر اچھے موڈ میں تھا جو اس نے ساری چیزیں لا کر موسی کے آگے ڈھیر لگا دیں۔ پہلے تو موسی نے سنگار میز کو ٹھیک کیا اور اس پر کور بچھایا، پھر الماریوں کی طرف بڑھی۔ ریک پر کپڑا بچھاتے بچھاتے وہ اونگھنے لگی۔ بار بار آگے کی طرف اس کا سر ڈھلک ڈھلک پڑتا تھا۔ مگر چلتے ہوئے پنکھے کی ہوا سے جب اس کو ٹھنڈک لگتی تو پھر وہ چونک پڑتی۔ لگاتار ایک گھنٹہ تک وہ اسی طرح جھولا جھولتی رہی۔ کبھی آگے اور کبھی پیچھے کی طرف۔ اس کی نیند جب ٹوٹی تو وہ ایک دم سے ہڑ بڑا کے مسہری کی طرف بڑھی۔ کمرہ خالی پڑا تھا، تیز بلب روشن تھا اور لیئے ہوئے پنکھے کی گھنگھناہٹ موسی کو بڑی اچھی لگی۔ اس نے پہلے توشک بچھائی اس پر سے دری، پھر اس کے اوپر سے بہترین کونٹر پین بچھا کر پائنتی کی طرف اوڑھنے کو اسی طرح کا عمدہ جازم تہہ کر کے رکھا۔ جب ان کے اوپر سے بلو اور نارنجی ملے جلے رنگ کا بیڈ کور ڈھانپنے لگی تو اچانک اس کو اپنا بستر یاد آ گیا۔ اس کا وہ پھٹا ہوا اکلوتا گینڈڑا جو صابن سے دھلنے پر بھی کبھی سفید رنگ اختیار نہ کر سکا تھا اور اپنے اس بستر پر سونے میں کبھی موسی کا جی نہ بھرتا تھا۔ مگر بوسیدگی، غربت اور بیچارگی کے باوجود پھر بھی موسی کو اپنے اس گینڈڑے سے محبت تھی۔ دس سال سے اسے وہ بچھاتی آ رہی تھی اور پندرہ سولہ سال قبل کے گھر میں جتنے پرانے اور پھٹے کپڑے تھے وہ سب کے سب اس میں سانٹ کر سجا دئے گئے تھے۔ موٹی موٹی سلائیاں دے کر وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جوڑ دئے گئے تھے۔ موسی کے لئے اس کا گینڈڑا کیا کچھ نہ تھا۔ وہ ایک ڈائری بھی تھا، اور ایک البم بھی۔ اس بچھونے میں موسی کی شادی سے لے کر اس کے بچے اور میاں تک کے کپڑوں کے ٹکڑے تھے۔ اور جب بھی موسی کو کوئی کام نہ رہتا تو بچھونے پر پڑی ہوئی اس کو بہت سی باتیں یاد آ جاتیں۔ ساڑی تہکوا کے باپ نے ہولی میں لا کے دی تھی۔ اسی بچارے کی یہ دھوتی ہے ایک دفعہ غصہ میں بڑکے موسی نے اُسے اپنے ہاتھوں سے ایک جگہ سے پھاڑ دیا تھا۔ اور اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد میں آ کر ایک لمبا سا سلسلہ قائم کر دیتیں۔ جس میں مسرت اور غم دونوں کے پہلو ہوتے تھے۔ مگر بستر لگاتے لگاتے تیس (۳۰) سال کے لمبے عرصے کے بعد موسی کے دل میں ایک نئی اور انوکھی تمنا پیدا ہوئی کہ وہ اس مُسہری پر ذرا لیٹ کر دیکھتی کہ اس پر سونے میں کیسا لگتا ہے۔ جھک کر بستر لگانے میں اس کے کمر کا درد بڑھ گیا تھا اور وہ مُسہری کا پائنتی پکڑ کر آگے کی طرف جھک گئی۔ " ہائے رام، کیسا درد اُٹھا ہے۔ اس کا جی بیکل ہونے لگا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھرانے لگے اور آنکھیں بے اختیار بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اس وقت اپنی

کوٹھری اور بچھونے کا خیال اس کو ایورسٹ کی بلند چوٹیوں سے کسی طرح کم نہ لگا۔ وہ بیمار تھی اور یہ کیبن مریضوں ہی کے لئے تھا۔ کمرے کا گوشہ گوشہ موسی کا اپنا تھا۔ جہاں اس نے اپنی جوانی بتائی تھی۔ جس جگہ وہ اپنے میاں سے روٹھ روٹھ کر چھپ جایا کرتی تھی۔ کیا ایسی کٹھری میں دو چار گھنٹوں کے لئے یہ کمرہ موسی کو پناہ نہ دے سکے گا؟ پھر موسی نے ادھر ادھر دیکھ کر سوچا۔ پتہ بھی کس کو چلے گا؟ کیبن کی کنجیاں تو اسی کے پاس رہتی ہیں۔ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ اندر سے کمرہ کھول کر جھاڑنے پونچھنے لگے گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ مشکلوں سے دروازے کے پاس گھسٹتی ہوئی پہنچی۔ باہر سے کاٹھ کی جھلملی دار کیواڑ کو کھینچ کر لگا یا۔ پھر پردے کو درست اور برابر کر کے چٹخنی لگا دی۔ کیواڑ اور پردے وہ ہمیشہ ہی سے ٹھیک کرتی رہی تھی۔ لیکن اس وقت ایسا کرتے ہوئے اس کو بڑا ہی اچھا لگا۔ پہلے اس کی نظر اپنی ساڑی پر پڑی اور پھر اپنے ننگے پیر پر۔ اس کا دل ذرا اداس ہو گیا۔ مگر اس نے بڑی توجہ سے اپنی چال کا انداز بدلا۔ اور چلتی ہوئی آئینہ کے پاس آ کر تھوڑا مسکرائی! بدن پھوڑے کی طرح ابھی تک دکھ رہا تھا اور اب تو آنکھیں بھی جلنے لگی تھیں۔ اس نے آہستہ سے روشنی بجھا دی اور مسہری پر سیدھی لمبی لیٹ کر اوڑھنے کی چادر کے ساتھ پلنگ پوش کو بھی گردن تک اوڑھ لیا اور بڑی لمبی اور ٹھنڈی سی سانس اس کے منہ سے نکل گئی۔ وہ ہلکے اندھیرے ہی میں ایک بار پھر مسکرائی، جوانی سے لے کر اب تک کبھی ایسا پھولوں کا سیج ملا تھا؟ بیس ۲۰ روپیہ روز والا کمرہ، کبھی نصیب ہو سکتا تھا؟ وہ اپنی چالا کی پر خوش ہو رہی تھی۔ اب پنکھے کی ہوا سے اس کو بیزاری لگنے لگی تھی۔ لیکن اٹھ کر خود سے پنکھا بند کرنا کتنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا کوئی یہ پنکھا بجھا دیتا۔ پھر اس کے دل میں یہ تمنا سی ہوئی کہ نرس آ کر اس کو بھی تھرمامیٹر لگائے۔ موسی کی آنکھوں میں جیسے مرچی سی لگ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نرس، جمعدار، اس کو باری باری یاد آتے گئے۔ ''اونہہ۔ چھی'' غسلخانہ سے فنیل کی آتی ہوئی بو، آج اس کو بہت بری لگ رہی تھی اس نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ اور باتھ روم کی روشنی بھی جلتی رہ گئی تھی۔ اب اسے کون بجھائے گا۔ موسی نے بڑے باوقار انداز میں لیٹے ہی لیٹے سر کے چھوٹے آنچل کو ٹھیک کیا اور اس کا جی بے اختیار چاہا کہ غسل خانہ کی کیواڑ بند کرنے کو پکارے، ''موسی''! اور موسی کا خیال آتے ہی اس کا جی دھک سے رہ گیا۔ موسی، کون تھی؟ کہاں تھی۔ وہ اس کو جانتے ہوئے بھی انہیں جاننا چاہتی تھی۔ آج وہ خدمت لینا چاہ رہی تھی۔ درد کے ساتھ ہی دل تیزی سے دھڑکے جا رہا تھا۔ اور سانس بھی دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ مگر وہ اٹھ نہ سکتی تھی۔ بڑی بیچارگی سے اس نے آنکھوں کو بند کر کے سوچنا

شروع کر دیا کہ ڈاکٹر اس پر جھکے ہوئے ہیں۔ یہاں درد ہے ہاں ہاں بس یہیں پر۔ اور نرس برف دے کر پانی پلا رہی تھی۔ ہائے بچاری کب سے پیاسی تھی۔ نیند کا خمار بڑھتا چلا گیا۔ موسی کا سر تکیہ پر ایک طرف ڈھلک گیا...... ڈاکٹر...... ڈاگڈر بابو...... بابولوگ...... مس...... مس صاحب---اور موسی خراٹے لینے لگی۔ گدگدے بستر پر بے خبر سوئی ہوئی موسی بیس ۲۰ روپیہ روز والے کمرہ میں گردن تک بہترین بیڈ کور اوڑھے ہوئے اپنی زندگی کے خواب پورے کر رہی تھی---مگر ہڈی توڑ درد کے باوجود بھی موسی آرام نہ کر سکتی، نہانے کا ٹب، منہ دھونے کا بیسن اور پاٹ رگڑ رگڑ کر اس سے صاف کرایا جا رہا تھا---''

فلش کموڈ میں اوپر اوپر تک پانی بہہ رہا تھا اور گندگی سارے باتھ روم میں پھیلتی جا رہی تھی اور یہ سب اکیلی موسی کے سر پر پڑا تھا۔ موسی کا جی جل اُٹھا۔ باپ دادا، راج کبھی کسی نے فلش دیکھا بھی تھا۔ جنم تو کھپ گیا، بندر کا جانے آدمی کا سواد، اور اس نے ناک پر آنچل لپیٹتے ہوئے کہا۔'' ہائے رام چھی چھی---بھلا ایسے ایسے لوگ بھی آویں ہیں کیبن میں''؟ اور کسی نے زور سے گرجتے ہوئے اس کو مسہری پر سے کھینچ لیا---بڑی نواب زادی کی دُم بنی ہے--- بڈھی چڑیل--- دن کافی چڑھ آیا تھا اور بند کمرے میں باتھ روم کے کھلے ہوئے دریچہ میں سے نصیر دربان اندر گھس آیا تھا---بھلا کوئی دیکھے تو اس کی شوخی---رات بھر کیبن میں ٹھاٹ سے پڑی سوتی رہی اور تمام ڈھنڈورا پٹ رہا ہے کہ'' موسی کہاں ہے، موسی کہاں ہے۔'' نصیر نے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ سسٹر کے ساتھ اور بھی کئی لوگ اندر گھس پڑے---تم شیطان بڑھیا---روج روج کھالی کمروں میں سوتا ہوگا۔ اسی واسطے کنجی اپنے پاس رکھتا ہے۔ سسٹر نے اس کے سوکھے ہوئے ہاتھ کو پکڑ کر باہر کھینچا---ابھی ہم سپرینٹنڈنٹ کو رپورٹ کرے گا۔ یہ کیبن ہے---بیس ۲۰ روپیہ روج والا کیبن---تم کو ڈسچارج کردے گا۔ ابھی نکالے گا تم کو۔''

موسی کا بخار میں ڈھکا ہوا ہاتھ پکڑتے ہی سسٹر کا غصہ کم ہو گیا۔ رات بھر موسی بخار میں جلتی رہی اور اس وقت مارے تکلیف کے اس کی آنکھیں اُبل پڑ رہی تھیں---وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ بول سکی۔ جیسے کوئی بات اس کی سمجھ ہی میں نہ آ رہی تھی---کہاں کیبن کی مُسہری اور کہاں ابھی ابھی تو وہ پاٹ صاف کر رہی تھی۔

بوڑھا جناب میاں نصیر اور رام چندر لفٹ میں، سسٹر کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ سرکار پرانی آدمی ہے۔ بس ایکی دفعہ بھر معاف کیا جائے---جو جرمانہ ہو سرکار خود ہی لگا دیں۔

رپورٹ کرنے سے ہم سب بدنام ہوں گے اور سب پر کڑی نظر ہو جائے گی---'' مگر سسٹر کہنے لگی کہ اس طرح تو سب کے سب جمعدار اور دربان بھی کیبن میں سونا پڑنا شروع کر دیں گے۔ مگر آخر میں اس کو بھی موسی پر رحم آ گیا---اچھا تو ہم رپورٹ نہیں کرے گا--- موسی کے مشاہرے میں سے بیس ۲۰ روپیہ جو کیبن کا چارج ہے کاٹ لیا جائے گا۔'' نہیں تو یہ حرکت سب کے سب کرنے لگیں گے---! سبھوں نے بہت کہا سنا کہ حضور اتنا نہیں بڑھی مر جائے گی مگر جب سسٹر نے یہ آخری بات کہہ دی کہ یا رپورٹ یا پھر بیس ۲۰ روپیہ واجب کرایہ تو سب کے سب چپ رہ گئے۔

اور دیوار سے لگی ہوئی موسی بڑی خاموشی سے حساب لگاتی رہی۔ تیس ۳۰ سال۔ تیس ۳۰ دن اور بائس ۲۲ روپے۔۔۔ جس میں سے اگر بیس ۲۰ روپیہ جرمانہ میں چلے گئے تو پھر کتنا بچا---؟ دو ۲---اور دو ۲ ہی روپے میں بھارت کے اندر وہ---زندہ رہ کر---اپنے نکلے ہوئے چاند کو کبھی چمکتا ہوا بھی دیکھ سکے گی---؟

خوش آمدید

اختر صاحب کو ۱۹۳۸ء کی دسمبر میں پٹنہ کالج میں لکچرر شپ ملی تھی اور ایسی اچانک ملی تھی جیسے خدا نے بیٹھے بیٹھائے چھپر پھاڑ کر یہ ملازمت انہیں دے دی ہو۔ان دنوں اختر صاحب اپنے عزیز دوست شرف الدین احمد عظیم آبادی کے کوارٹر میں گردنی باغ میں ٹھہرے ہوئے تھے، میں ارول میں تھی۔وہیں ملازمت کی خوشخبری ملی۔اختر صاحب کے ارجنٹ تار پر جب میں پہلی بار ارول سے پٹنہ پہنچی تو مجھے نہ تو اسٹیشن پر اختر صاحب ملے اور نہ ان کے ٹھہرنے کی جگہ معلوم تھی۔آخر تھک کر میں سیدھی رضا نقوی صاحب کے گھر مکھنیاں کنواں ٹھہر گئی کافی دیر کے بعد اختر صاحب آ گئے،معلوم ہوا ابھی ان کے مکان کا افتتاح نہیں ہوا ہے۔رضا صاحب کا مکان ان کے اپنے خاندان اور خاندانی مہمانوں سے بھرا ہوا تھا،پھر بھی انہوں نے ہماری بڑی خاطریں کیں اور بڑا اچھا کھانا کھلایا۔دوسری صبح کو ہم سب لوگ ایک بگھی پر سوار ہو کر مصلح پور آئے بگھی کے اندر شرف صاحب، رضا صاحب، تمنائی اور طفیل احمد خاں بھی تھے،سب کے چہرے خوشیوں سے لہک رہے تھے،طفیل صاحب عمر میں سب سے چھوٹے تھے اسی لئے وہ سب سے زیادہ شور بھی مچا رہے تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے کسی دولہا کی برات جا رہی ہو اور براتیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔طفیل صاحب شعر پر شعر سناتے جا رہے تھے۔اب تک صرف ایک مصرعہ مجھے یاد رہ گیا ہے جس کو وہ بڑے پیار سے لہک لہک کر سنا رہے تھے   ع

"ہر بند سے ٹپکا پڑتا ہے، ہر جوڑ سے چھلکا جاتا ہے"

اختر صاحب نے سب سے پہلا مکان جو کرائے پر لیا وہ مصلح پور کا تھا، کافی بڑا مکان، بڑے بڑے روشن ہوادار کمرے تھے، کھلی ہوئی چھت تھی اوپر کی منزل پر بھی بڑے اچھے سے دو کمرے تھے۔مگر اس گھر میں نہ تو لائٹ تھی نہ پانی کا نلکا تھا۔گھر تک پہنچنے کا راستہ ایک صاف ستھری گلی سے ہو کر آتا تھا۔گھر کے دونوں طرف کھلے ہوئے میدان تھے جو شہر کے اندر ایک بڑی نعمت تھی۔اس گھر میں سب سے پہلے

مہمان مجاز آئے تھے بزم ادب کا جلسہ رات کو ہونے والا تھا۔ جلسہ بڑے دھوم دھام سے ہوتا رہا اور مجاز کو دیکھنے اور سننے کی خاطر لوگ دوسرے شہروں سے ریلوں اور موٹروں پر چڑھ چڑھ کر آئے ہوئے تھے اور بارہ بجے رات تک مجاز کی خوبصورت نظموں اور رسیلی آوازوں پر سر دھنتے رہے تھے۔

ان دنوں اختر صاحب کے عزیز دوستوں سے پٹنہ بھرا ہوا تھا جن میں کوئی شاعر، کوئی ادیب اور کوئی نقاد تھے، اور کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو علی گڑھ کالج میں مجاز کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ صبح کو ملنے ملانے والوں کی بھیڑ جب چھٹ چکی تو صرف دوستوں کی منڈلی نے مجاز پر اپنا قبضہ جما لیا۔ کچھ گنگناہٹیں ابھریں اور کچھ ترنم کا خمار چھایا، میں کیواڑ کی اوٹ سے لگ کر ان رسیلے گیتوں کو سننا چاہ رہی تھی کہ اچانک مجاز کا کمرہ بند کر دیا گیا۔ اب جو بھی ہو لیکن میں بند کمرے کے اندر جھانک کر مجاز کو دیکھنے کی اپنی خواہش کو روک نہ سکی اور آخر تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک دڑار مجھے مل گئی اور میں بڑے ذوق وشوق سے جھانکنے لگی۔ مجاز اپنے بستر پر تکیہ سے اڑے بیٹھے تھے۔ دبلے، پتلے سے اونچی لمبی ناک اور کان تک لوٹتے ہوئے سیدھے بال۔۔ سبھی لوگ ہنس رہے تھے، مسکرا رہے تھے۔ مجاز کے آگے ایک کاپی کھلی دھری تھی اور ان کے ہاتھ میں شربت کا گلاس تھا۔ کچھ اور لوگوں کے ہاتھوں میں گلاس تھے۔ میں نے بڑے غور سے دیکھا اختر صاحب ذرا دور تھے۔ مجاز نے شربت کا ایک گھونٹ لیا۔ کاپی کے اوراق الٹے اور گنگنانے لگے۔ ع

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا

ابھی دوسرا مصرعہ سننے بھی نہ پائی تھی کہ کسی نے مجھے پیچھے سے جھنجھوڑ ڈالا۔ آپا۔ آپا---اس بند کمرے میں شراب پی جا رہی ہے۔ میں حیرت زدہ سی رہ گئی شراب؟ اس گھر میں شراب؟ جہاں پانچوں وقت کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ جہاں اخلاق اور مذہب پر بڑی لمبی، لمبی اور اونچی اونچی باتیں کی جاتی ہیں ایسا لگا جیسے مجھ پر بجلی سی گر پڑی ہے، میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ مجاز کے آنے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی اور میں چپکے سے اپنے کمرے میں اوپر چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اختر صاحب کے آنے کی آہٹ ملی، میں نے اپنے آنسوؤں کو پونچھ لیا اور بڑے غور سے اختر صاحب کو آتے ہوئے دیکھنے لگی۔ سنتی آئی تھی کہ شراب پینے والوں کے قدم لڑکھڑاتے ہیں مگر اختر صاحب بغیر لڑکھڑائے اپنی چال سے چلتے میرے پاس آئے ''ارے تم یہاں ہو وہاں مجاز اپنی

نظمیں سنا رہے ہیں'' میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی، ان کے قریب آئی پہلے ان کے کپڑوں کو سونگھا پھر بڑی روئی ہوئی آواز میں بولی ۔۔۔'' آپ ذرا اپنا منہ کھول کر سنگھائیے تو۔۔؟ وہ زور سے ہنس پڑے ۔۔۔ دماغ خراب ہوگیا ہے؟ اور ایک گہری سانس لے کر میرے منہ پر چھوڑ دیا ۔۔۔'' خدایا تیرا شکر ہے'' میں نے مطمئن ہوکر ان کو دیکھا اور وہ ہنستے ہوئے پھر نیچے چلے گئے ۔

مجاز کئی دنوں تک ہمارے گھر ٹھہرے ۔ پٹنے کی شوخ اور چنچل لڑکیوں نے جھانک جھانک کر مجاز کو دیکھا ۔ ان دنوں ارول سے نگار اور سوز بھی آئی ہوئی تھیں ۔ مجاز کی جن نظموں نے ان لڑکیوں کی رات کی نیند آنکھوں سے اڑا دی تھی، اب انہی رسیلی نظموں کو وہ مجاز کی آواز اور اس کے خوبصورت ترنم میں سن رہی تھیں ۔ شاعری کا احساس رکھنے والی لڑکیوں کے چہرے ان ثمار آگیں نظموں کو سن سن کر گلنار کی طرح دمک اٹھے تھے ۔ پردے کے اندر سے دبی دبی چھیڑیں چل رہی تھیں ۔ پیسوں کی بارش ہو رہی تھی اور گھنگھروؤں کے بجتے ہوئے بول جیسی آواز والے شاعر کو قریب سے دیکھنے کی حسرتوں کا صاف پتہ چل رہا تھا، مجاز نے شاید ان ساری پس پردہ کیفیتوں کو محسوس کر لیا تھا جب ہی تو انہوں نے اپنی یہ نظم سنائی کہ ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل کا اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس نظم کو سن کر پردے کے پیچھے بجتی ہوئی چوڑیاں اچانک زنجیروں کی آواز محسوس ہونے لگی تھیں ۔ جس دن مجاز واپس جا رہے تھے سارے گھر پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی ۔ سب کے چہرے اداس تھے ۔ مجاز چلے گئے پھر ہمیشہ کے لئے چلے گئے مگر ان کے گائے ہوئے نغموں کی گونج، سنائے ہوئے لطیفوں کی ہنسی اور زندہ دلی کے ساتھ لگائے ہوئے قہقہوں کی یاد ابھی تک ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں ۔

مصلح پور کا زمانہ بڑا پرسکون تھا ۔ اختر صاحب کی تھوڑی سی تنخواہ میں اچھی خاصی فارغ البالی سے گزر ہو جاتا تھا ۔ جنگ چھڑ چکی تھی اخباروں کی سرخیاں بڑی رنگین اور پرکشش رہنے لگی تھیں ۱۹۴۰ء کی گرمی کی چھٹیوں میں ہم لوگوں نے مصلح پور چھوڑ دیا تھا ۔ اختر صاحب بیمار تھے ۔ رضا صاحب نے سامان کے ساتھ ہم لوگوں کو کچھ دنوں کے لئے انجمن اسلامیہ کے احاطے میں اپنے کسی دوست کے ایک چھوٹے سے خالی گھر میں ٹھہرا دیا تھا ۔ آخر طئے یہ پایا کہ اختر صاحب کو لے کر میں ارول چلی جاؤں ۔

کالج کھلنے کے بہت پہلے اختر صاحب کی طبیعت اچھی ہو چکی تھی، اس دفعہ جو ہم لوگ پٹنہ آئے

تو ہمیں مہندر و میں ایک بڑا رنگین بیل بوٹوں والا اور بجلی کی روشنی سے جگمگاتا ہوا گھر ملا تھا۔ پانی کا نکا اور پنکھا یہاں بھی نہیں تھا۔ لائٹ کو دیکھ کر طبیعت کھل اٹھی تھی مگر ہائے رے برسات کی امس کہ جی بھر کے خوشیاں منانے بھی نہ پائے تھے کہ گھر کے سارے لوگوں کو یکبارگی یہ احساس ہونے لگا کہ یہ مکان ایک بڑا موٹا، رنگین اور گرم لحاف ہے جس کے اندر اس بلا کی گرمی میں ہر وقت تڑپتے رہنا ہے۔ دو ہی مہینے کے بعد ہم لوگ رانی گھاٹ کے ایک چھوٹے مگر کھلتے ہوئے احاطے دار کوارٹر میں آ گئے تھے۔ یہاں آ کر ایسا محسوس ہوا جیسے ہم لوگوں نے اپنی قبروں سے نکل کر دوبارہ نئی زندگی حاصل کی ہے۔ کوارٹر کے پیچھے بہت بڑا کھلا ہوا میدان اور اس میدان کے بعد گنگا کا مچلتا ہوا حسن تھا۔ سامنے کھلی ہوئی فضا اور چمکتی ہوئی سڑک تھی۔ احاطے میں گل مہر کا درخت تھا، چمیلی کی خوشبودار لتیں، ایسی خوبصورت اور صاف ستھری جگہ آ کر ہم مچھروں کی بے پناہ یورش اور قریب ہی شمشان گھاٹ کی طرف سے آنے والی ''رام نام ست ہے'' کی ہیبت ناک آواز کو بھی نظر انداز کر گئے تھے۔

۱۹۴۲ء میں نیشنل وار فرنٹ کے پروپگنڈے کے لئے حفیظ جالندھری سرکاری طور پر آئے تھے اور ''کرشن کنج'' میں مہمان ٹھہرائے گئے تھے۔ اہل فن، فن پرستوں اور کالج کے طلباء، کے ایک مجمع میں گھرے ہوئے حفیظ جالندھری نے اپنی کئی بڑی اچھی اچھی نظمیں سنائیں۔ ''نیشنل وار فرنٹ'' میں شرکت کے لئے انہوں نے اختر صاحب پر بہت زور دیا، مگر اختر صاحب اور آنجہانی پروفیسر ودیارتھی جی نے شرکت سے صاف انکار کر دیا۔ ہندی کے بڑے شاعر دنکر جی بہار کے ناظم کی حیثیت سے ''نیشنل وار فرنٹ'' میں شریک ہوئے۔ انہی دنوں ہندوستانی کمیٹی میں شرکت کرنے کے لئے مولانا عبدالحق صاحب پٹنہ تشریف لایا کرتے تھے۔ آپ کا قیام پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب کے یہاں ہوا کرتا تھا۔ ایک بار ''بزم ادب'' کے ایک سالانہ جلسے ''روحوں کے مشاعرے'' میں بھی مولانا عبدالحق صاحب شریک ہوئے تھے۔ پہلے سالانہ جلسوں میں صرف مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور شعرا ہی بلائے جاتے تھے لیکن مولانا عبدالحق صاحب کے آنے سے ناقدین اور محققین کی آمد کا بھی آغاز ہوا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے بزم کے سامنے ایک خطبہ بھی دیا تھا۔ غالباً اسی دوران سب سے پہلی بار آل احمد سرور صاحب پٹنہ تشریف لائے تھے۔

۱۹۴۶ء کے ستمبر میں پانچ بڑے اچھے اور پرسکون سال رانی گھاٹ میں گزار کر ہم لوگ پٹنہ کالج کے اندر مسلم ہوسٹل ''جواب اقبال ہوسٹل ہے'' کے سپرینٹنڈنٹ کوارٹر میں چلے آئے۔ ہوسٹل سپرینٹنڈنٹ

ہونے کے بعد اختر صاحب کی شگفتگی کسی حد تک مدھم پڑ گئی تھی ان کو یہاں کے ہنگاموں، الجھنوں اور آفس کے بیکار کاموں کی دردسری سے بڑی گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ وقت بے وقت لڑتے جھگڑتے طلباء جب اپنی شکایت لے کر پہنچ جاتے تو اختر صاحب اپنے کو ''مولوی چن چن'' بنا ہوا محسوس کرتے، جو اختر صاحب کے ہوسٹل میں رہنے کے زمانے میں یہاں کے سپرینڈنٹ تھے اور جن کو اختر صاحب اور ان کے دوستوں کا گروپ ہمیشہ طرح طرح سے ستایا کرتا تھا جب بھی اختر صاحب کو مولوی چن چن یاد آجاتے، وہ کسی نہ کسی بہانے مجھ سے آکر جھگڑنے لگتے کہ ''اس مہمل اور بے ہنگم جگہ تم ہی نے مجھ کو پھنسایا ہے''۔ اختر صاحب کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ یہاں کے فضول کام میں انہیں ادبی کاموں کا وقت نہیں ملتا۔ بڑی مشکلوں سے تھوڑا وقت نکالنا پڑتا ہے۔

اس گھر میں سب سے پہلی بار ادیبوں میں پروفیسر احتشام حسین صاحب تشریف لائے۔ شاید یونیورسیٹی کے کسی کام کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ کوئی تکلف نہیں، بھولے بھالے سے مگر بڑے گمبھیر ---- سر سے پاؤں تک ایسا رعب چھایا ہوا کہ نگاہیں ان کے سامنے جھکی جھکی سی رہتی ہیں۔ میں نے احتشام صاحب کا سفر نامہ ''ساحل اور سمندر'' جب پڑھا تھا تو ان کے ایک ایک لفظ پر جھوم جھوم اٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں میں احتشام صاحب کی اپنائیت، سادگی اور پرخلوص باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کی شخصیت اور سنجیدگی سے بہت مرعوب ہوگئی۔

فراق صاحب نے کبھی ہمارے گھر پر قیام نہیں کیا۔ ایک بار وہ قمرالدین صاحب کے گھر تشریف لائے تھے اختر صاحب کو خبر ملی اور وہ فراق کو چند گھنٹوں کے لئے اپنے گھر ''گلاب باغ'' میں لے آئے۔ میں ان دنوں بھی پٹنہ میں نہیں تھی سنا کہ کھلی چھت پر مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ احباب اور کالج کے طلباء نے فراق کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک اچھے خاصے مجمعے میں یہ گھریلو مشاعرہ بڑا کامیاب رہا۔ یہ جلسہ گھر پر اس لئے ہوا تھا اعلان کرنے کے بعد پرنسپل نے فراق کو کمیونسٹ قرار دے کر کالج کے اندر جلسہ کرنے سے روک دیا تھا۔ مجبوراً گھر کی چھت پر چار انجمنوں کی طرف سے یہ جلسہ کیا گیا جن کے نام یہ ہیں۔ بزم ادب پٹنہ کالج، حلقہء ادب پٹنہ، بزم اردو بی این کالج اور ترقی پسند مصنفین۔ اس سے پہلے پرویز شاہدی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کالج کے بجائے تھوسوفیکل ہال میں جلسہ کرنا پڑا تھا وہ جب بھی کلکتہ سے بزم ادب یا ادبی جلسوں کی شرکت میں بلائے گئے تو بڑے خلوص سے ہمارے گھر ملنے کو آتے رہے ہیں۔ جوش ملیح آبادی

بھی کئی بار پٹنہ تشریف لائے ہیں۔روش صدیقی بھی بزم ادب کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ہیں وہ اختر صاحب کے حلقہ احباب میں ہیں۔

۱۹۵۱ء میں نکلتے جاڑوں کے دن تھے،ہم لوگ گلاب باغ کی بالائی منزل پر رہتے تھے۔کسی نے زینوں پر اختر صاحب کو پکارا،اختر صاحب گئے مگر آنے والے کو پہچان نہ سکے،رات کا وقت تھا اور یہ آواز بھی ان کے گوش گزار نہ ہوئی تھی،کمرے کے اندر روشنی میں اپنے مہمان کو لے کر آئے جو بہت دبلا پتلا تھا،گرم کوٹ اور مفلر میں لپٹا ہوا ہاتھ میں ایک بیگ لئے نظر آیا۔اختر صاحب نے مجھکو پکار کر کہا'' بھئی شکیلہ ۔۔اپندر ناتھ اشک جی تشریف لائے ہیں۔''میں نے کچھ ناشتے کے ساتھ چائے بھیج دی،اندر کمرے سے دونوں کے ہنسنے اور بولنے کی صاف آواز آرہی تھی اور میں حسرت سے دور کا جلوہ بھی نہ دیکھ سکی۔کافی رات گئے اشک جی کھانا کھا کر واپس گئے۔

مئی ۱۹۵۱ء میں یہاں مشہور اردو کانفرنس ہوئی جس میں ریاستی انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا۔محترمی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس جلسے کی صدارت کی تھی،بہار کے لئے یہ کانفرنس ایک یادگار ہے۔جس میں شرکت کے لئے پنڈت کیفی،عرش ملسیانی،مجاز،جذبی،آل احمد سرور،ڈاکٹر عبدالعلیم،پرویز شاہدی،جگن ناتھ آزاد،خواجہ احمد فاروقی،آنند نارائن ملا اور سلام مچھلی شہری تشریف لائے۔بہن صالحہ عابد حسین اور حمیدہ سلطان صاحبہ نے ہماری مجلس کو رونق بخشی تھی۔

گلاب باغ کے خوبصورت مکان کے ایک حصے میں پانی کی انتہائی کمی تھی اور دھوپ کی تپش کی تکلیفیں اٹھا کر ہم لوگ بڑی مشکلوں سے چھجو باغ کے نئے بنے ہوئے آفیسرس کوارٹر میں چلے گئے۔مکان کافی کھلا ہوا،روشن اور آرام دہ تھا۔پانچ کمرے تھے سبھی کمروں میں سلنگ فین لگے ہوئے تھے۔واش بیسن فلش سسٹم اور بڑا سا احاطہ۔سبھی کچھ تھا۔مگر سامنے ہریجن کولونی جھونپڑیوں میں بسی ہوئی تھی۔اور محلے کی ساری گندگی اسی جگہ سے موٹروں میں ڈالی جاتی تھی۔سرکار نے اپنے آفیسروں کے لئے ایسی جگہ مکان کیوں بنوائے تھے سمجھ میں نہ آتا تھا،پھر خبر ملی کہ یہ گندگیاں یہاں سے جلد ہٹائی جانے والی ہیں۔مگر یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نظر نہ آیا۔

عرش ملسیانی پٹنہ کئی بار تشریف لائے ہیں۔ایک دفعہ دن بھر کے لئے غریب خانے پر ٹھہرے۔بزم ادب کے جلسے میں آئے ہوئے تھے،طلباء اسٹیشن جا کر بڑے اہتمام سے انہیں میرے گھر لائے تھے۔

گول بھرا بھرا چہرہ۔۔ بھاری جسم، صاف صندلی رنگ، درمیانہ قد، آپ صبح کی گاڑی سے آئے تھے۔

فطرت نے شاید اپنی آزمائش کے لئے ہمیں پچھو باغ کے ۵ نمبر کوارٹر میں بھیج دیا تھا، جہاں ہم نے بڑی قیامت کی گھڑیاں کاٹ کاٹ کر سات سال گذارے تھے۔ سارے دروازوں اور دریچوں کو بند رکھتے ہوئے ہم لوگوں نے یہ وقت کاٹے تھے۔ اس گھر کے احاطے میں ہمارے پھول بھی کھلتے تھے، پیارے پیارے بچوں کی ٹولیاں کھیلتی ہوئی بھی نظر آتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اسی ہریجن کولونی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر اور مہیش بابو منسٹر کی چمکتی ہوئی کاریں بھی ان کے گھر والوں اور میری دوستوں اور ملنے والیوں کو لے کر آجاتی تھیں۔ جس وقت پچھوا ہوا کے ساتھ بدبو کا جھونکا میرے گھر کے کونے کونے میں سما جاتا تھا تو میں اپنے مہمانوں کے آگے شرم سے پانی پانی ہوجاتی تھی۔ جبکہ اس کوارٹر کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا تھا۔۔۔ پچھو باغ کے اس ۵ نمبر کوارٹر میں سب سے پہلے مہمان ہمارے محترم پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب تھے۔ وہ ہمارے یہاں چند روز ٹھہرے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے استاد شعبہ فارسی کے پروفیسر حسینی صاحب بھی آپ کے ساتھ تھے۔۔۔ سروری صاحب کی وجہ سے ہمارے گھر میں چند دنوں تک بڑی رونق رہی تھی۔ علمی چرچے اور مذاکرے ہوتے رہے، ادبی گفتگو کے علاوہ آپ بار بار یہ کہتے تھے کہ بہاریوں کا مزاج اور ان کے رہنے سہنے کا طریقہ حیدرآبادیوں سے ملتا جلتا ہے پروفیسر سید حسن عسکری اور اختر صاحب کے ذریعہ وہ پھلواری شریف کے مرثیوں کے چند قدیم قلمی نسخے ساتھ لیتے گئے تھے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ''وائی وا'' امتحان کے لئے غالباً ۱۹۵۶ء میں پٹنہ تشریف لائے تھے اور میرے ہی گھر قیام کیا تھا اردو ادب کے محقق اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے ہم سب لوگ زور صاحب سے واقف تھے، مگر ایک شگفتہ مزاج اور دلچسپ شخصیت کی حیثیت سے آپ کا تعارف اس وقت ہوا جب آپ پٹنہ تشریف لائے۔ آپ کے سر کے بال زلف نما تھے، بہت بلند پیشانی، صاف صندلی رنگ، بڑی بڑی روشن ذہین آنکھیں، پان کا اتنا شوق کہ پاندان ساتھ ساتھ چلتا تھا۔۔۔ جب بھی یہاں اہل ادب آئے اور چلے گئے تو رونقوں کے بعد تکلیف دہ سناٹا بہت کھلا ہے۔

اس ہریجن ٹولی کے مکان میں اختر صاحب نے کس کس بلند پایہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو نہ ٹھہرایا تھا۔ جب بھی مجھے مہمانوں کے آنے کی خبر ملی تو اچانک طور پر اس طرح کے بس انہیں اسٹیشن سے

گھر میں لایا جارہا ہے۔ اللہ! کیسی کیسی قیامتیں مجھ پر ٹوٹ رہی ہیں۔۔ ایسا گھر۔۔ ایسی گندگی۔۔ ڈوم اور مہتروں کا سامنے پرسوز ہنگامہ، لڑائی، اٹھا پٹک، نوچم نوچ۔۔ اور معزز مہمان اسی گھر میں ٹھہرائے جارہے ہیں۔۔ میرا تو مارے غم کے جیسے دل ڈوب جاتا، یہ باہر سے آنے والے مہمان ہمارے بہار کا کیسا نقشہ لے کر یہاں سے جائیں گے۔ جب بھی پٹنہ کا نام آئے گا ان کی نگاہوں میں اس ہریجن ٹولی کا سارا منظر سامنے آجائے گا۔۔۔ اگر موقع ملتا تو کبھی اختر صاحب سے جنگ ہو جاتی اور کبھی لڑکر جی کا بخار اس نکالنے کا وقت بھی نہ ملتا تھا۔

اسی طرح باہر کی ہما ہمی دیکھ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ ابھی ۵ بجے کی گاڑی سے جگر مرادآبادی آرہے ہیں اور اسی گھر میں ٹھہرائے جائیں گے۔ میں دھک سے رہ گئی۔ جگر صاحب آئے اور ان کے ساتھ ایک رونق سی چلی آئی۔ حلقہ ادب کا سالانہ جلسہ تھا، رات کو انجمن اسلامیہ میں مشاعرہ ہورہا تھا۔ جب انجمن اسلامیہ کے بھرے ہوئے ہال میں جگر مرادآبادی کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہوئے دیکھا تو میرا دل تھوڑی دیر کے لئے خوشیوں سے بھر گیا کہ آج یہ اتنا بڑا شاعر ہمارا مہمان ہے۔۔۔ مشاعرے کی رات بڑی یادگار تھی۔ جگر مشاعرے سے جب واپس آئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے ان کے ساتھ بہن سلطانہ حیات اللہ اور عزیزہ نقی امام بھی آگئی تھیں۔ جگر کے چہرے پر مشاعرے کی شادابی کا رنگ ابھی تک جھلک رہا تھا، اسی تابانی کو دیکھ کر سبھوں نے اصرار کیا اور میرے ڈرائنگ روم میں ایک چھوٹی سی مجلس جم گئی، جگر نے پہلے اختر صاحب کی دو ایک چیزیں سنیں، پھر اپنی غزلیں سنانے لگے، ایک خود فراموشی کی کیفیت میں وہ اپنی رباعیاں، غزلیں اور نظمیں سناتے چلے گئے اور ہم سحر زدہ سے سنتے رہے اور ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھتے رہے۔۔ سیاہ چہرہ، چمکتی ہوئی روشن آنکھیں۔۔ بولتے، ہنستے مسکراتے ہوئے پان سے رنگین لب۔۔ ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی، چھریرا جسم جو کبھی آگے اور کبھی پیچھے جھوم رہا تھا۔۔۔ اور ٹوپی کے نیچے سے گردن تک لوٹتے ہوئے سیدھے سے بال۔۔۔ جگر تین دنوں تک ٹھہرے گھر اور باہر بڑی رونق تھی۔ میں بچپن سے جگر کی غزلیں گنگناتی رہی تھی اور ان کے کسی کسی شعر پر تو دل جھوم جھوم اٹھتا تھا۔۔۔ آنکھوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی جگر ہیں۔ حسین ورنگین اور لطیف لفظوں میں محبت کا اتنا پیارا احساس جگا دینے والا شاعر۔۔۔ پڑھنے والوں کے تخیل میں خود کتنا حسین نظر آتا ہے۔

اس گھر میں اتنے معزز مہمانوں کی آمد سے میں ہمیشہ گھبرایا کرتی تھی۔ میں نے جب سے آنکھ

کھولی اور ہوش سنبھالا تھا اپنے گھر میں میز بانوں کو فرش راہ بنتے اور مہمانوں کی تواضع میں آسمان کے ستارے بھی توڑ لاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔گھر کے اندر اور باہر کئی دنوں پہلے سے مہمانوں کے آنے کی رونق اور ہماہمی کسی شادی اور عید کی طرح چھائی رہتی تھی۔۔۔۔مگر شہر کے اس گھر میں آ کر میں حیرت زدہ سی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی کہ ہندوستان کے اتنے معزز، اتنے مشہور اور اتنے بلند پایہ لوگ ایسے ہی اچانک طور پر ہریجن کولونی کے سامنے والے ایک معمولی سے گیٹ پر بڑے احترام کے ساتھ اتار دیئے جاتے تھے، اختر صاحب کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑتا تھا اور میں شرم سے کٹی کٹی سی نظر آتی تھی۔

غالباً ۵۳ء یا ۵۴ء میں آل احمد سرور صاحب میرے گھر مہمان ٹھہرے، اور حسب معمول میرا جی افسردہ ہو گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اختر صاحب سے لڑی بھی اور بچارے مہمان کی قسمت پر افسوس بھی کیا---جب سرور صاحب اختر صاحب کے ساتھ کالج اور یونیورسیٹی چلے گئے تو میں نے بڑے اطمینان سے جا کر اختر صاحب کے کمرے کا جائزہ لیا جہاں سرور صاحب کو ٹھہرایا گیا تھا۔ بہت ہی سادہ سامان تھا، ایک بستر، شیونگ کا ایک بڑا پرانا سیٹ، یو۔ پی کے دو تین اردو، انگریزی اخبار، ایک چھوٹا سا بیگ اور ایک معمولی سا لوہے کا اٹیچی نما بکس جسکا رنگ پرانا ہو کر جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔۔۔''یہ تھی سادگی ایک بڑے مشہور شاعر، نقاد اور پروفیسر کی'' اختر صاحب بچارے کے لوہے کے بکس کو اب تک ہم لوگ خواہ مخواہ ہی بساطی کا بکس کہتے رہے تھے۔'' میں نے اس اکیلے کمرے میں چپکے سے اپنی ہار مانتے ہوئے سوچا۔

اختر صاحب ٹھیک کہتے ہیں بڑے لوگوں کو اپنی چیزوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ان کی نگاہیں بلندیوں اور گہرائیوں پر ہوتی ہیں۔ان چھوٹی چھوٹی سطحی باتوں کو نہیں دیکھتیں۔تو شاید یہی بلند نظری تھی تب ہی تو اختر صاحب کافی اونچی اڑان پر رہتے ہیں، قمیض کے کولر اور کف پر کبھی کبھی چکٹ بھی جم جاتی ہے۔اور ہفتوں بغیر پولش کے جوتے پیاسے پڑے رہتے ہیں، جب دیکھو الٹا سوئٹر پہنے چلے آ رہے ہیں اور موزہ تو کبھی آج تک اختر صاحب نے سیدھا پہنا ہی نہیں---یہ پستیوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔ان کی طرف دھیان دینے کی بچارے کو فرصت ہی کہاں تھی؟

۱۹۵۸ء کے ۱۵/ اگست کو مجھے ہریجن کولونی سے چھٹکارہ ملا اور میں قریب ہی ۸ نمبر کوارٹر میں آ گئی۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب بزرگان ادب میں سے ہیں۔آپ ہمارے غریب خانے ۸ نمبر کوارٹر

میں کئی بار تشریف لائے۔ اختر صاحب اپنے کمرے کو اپنا ''مستقل حجرہ'' بنائے رکھتے ہیں لیکن اپنے ان ادبی بزرگوں اور دوستوں کے لئے ہمیشہ بڑی فراخ دلی سے اپنا کمرہ پیش کردیتے ہیں اور میرے لئے یہ مرحلہ ہوتا ہے کہ ان کے کمرے کی بے ترتیبی میں مہمانوں کی خاطر ترتیب اور سلیقہ پیدا کروں۔ اعجاز صاحب کی آمد پر بھی بڑی پیاری رونق ہمارے گھر پر چھائی رہی ہے اور میں نے آپ کے آنے پر ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے جیسے ہمارے بزرگ تشریف لائے ہیں آپ اختر صاحب کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ اعجاز صاحب پروفیسر احتشام حسین صاحب کے استاد ہیں اس حیثیت سے اختر صاحب ان کا بڑا احترام کرتے ہیں لیکن اعجاز صاحب ہمیشہ دوستانہ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔

نومبر ۱۹۶۰ء کو کرشن جی اور سرلا بہن بھی پٹنہ آئے۔ سہیل عظیم آبادی نے ان کو عزیزہ امام کے خوبصورت سجے سجائے مکان میں ٹھہرا دیا تھا۔ دوسرے دن ہم لوگوں نے دوپہر کے کھانے پر ان لوگوں کو بلایا، عزیزہ امام بھی تھیں۔ سہیل عظیم آبادی، باری ساقی، جمیل مظہری، کلیم الدین احمد، رضا نقوی، فضل اور ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شریک تھے، بڑی بے تکلفی سے سارے مہمان گھنٹے بھر باتیں کرتے ہوئے کھانا کھاتے رہے۔ کرشن چندر جی بڑے خلوص سے سبھوں سے ملتے رہے۔ بڑی اچھی گھریلو فضا تھی جس میں ادب کی کرنیں چمک اٹھی تھیں۔

۴ فروری ۱۹۶۱ء کی شام کو میرے گھر کے سارے لوگ دو موٹروں میں بھر کے پٹنہ اسٹیشن پر طفیل صاحب کے خیر مقدم کو گئے، اختر صاحب کی زندگی میں پہلا واقعہ تھا کہ وہ کسی مہمان کو لانے گئے تھے۔ طفیل صاحب کا نام آتے ہی نقوش کا پرچہ خود بخود نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے --- جی ہاں 'نقوش' کا خالق -- جو اردو کی خدمت کرتے کرتے شہادت کا مقام حاصل کرنے کا جوش و جنون رکھتے ہیں، وہی طفیل صاحب ابھی ایرانڈیا سے پٹنہ تشریف لارہے تھے --- ایک پاکستانی ادیب اور ایک مشہور پرچے کے مدیر پہلے پہل سرحد کی الجھنیں پار کر کے ہمارے ملک اور ہمارے گھر آرہے تھے۔ میں لاہور جا کر طفیل صاحب سے مل چکی تھی۔ ان کے آتے ہی لوگ ملنے کو آنے لگے۔ دوسرے دن طفیل صاحب کچھ تو پرمٹ وغیرہ کے چکر میں رہے پھر اسی طرف سے عزیز ان کو دربھنگہ ہاؤس اختر صاحب کے کلاس میں لیتے چلے گئے۔ اختر صاحب نے 'نقوش' کے ایڈیٹر کا اپنے کلاس میں تعارف کرایا۔ ایک لڑکی نے بے حد حیرت سے انہیں تکتے ہوئے بے اختیار کہہ دیا -- ''یہی طفیل صاحب ہیں؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ کوئی بڑے بزرگ ہوں گے، یہ لمبی

لمبی داڑھی ہوگی۔ مگر یہ--- یہ طفیل صاحب تو چھوٹے سے نکلے۔۔ پھر اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنے بڑے بڑے سے کام وہ کس طرح کرتے رہے ہیں؟۔'' اختر صاحب نے اتنی تھوڑی سی ملاقات میں طفیل صاحب کو بہار کی بہت سی خصوصیات اور تاریخیں بتائیں۔ یہاں کی مشہور خدابخش خاں کی لائبریری بھی دکھلائی۔

۱۹۶۱ء کا ستمبر ہم لوگوں کے لئے بڑے آزمائش کا تھا، ابا جان تشویش ناک طور پر بیمار تھے اور ہم سارے بھائی بہن ابا جان کے ساتھ پٹنہ میڈیکل کالج ہوسپٹل کے کوٹج میں بدحواس تھے۔ اختر صاحب سے ایک دن خبر ملی کہ خلیل الرحمن اعظمی آئے ہیں اور میرے ہی گھر پر ان کا قیام ہے۔ لیکن میں مل نہ سکی۔

۱۹۶۲ء کی ایک شام میں اختر صاحب کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک رکشہ آکر رکا، اس پر ایک بستر بھی تھا اور سوٹ کیس بھی۔۔ میں پچھلے دروازے سے اندر چلی آئی، اچانک باہر سے اختر صاحب کی بڑی خوشیوں بھری آواز آئی۔۔ ارے بھئی۔۔ جذبی؟۔۔ وہ شام بڑی افسردہ تھی، گذری ہوئی غم کی گھڑیاں ہم دونوں یاد کر رہے تھے، جذبی کے آجانے سے مجھے بڑا اچھا لگا--- جذبی کی غزلیں نہایت پیاری، بڑی رنگین اور خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان غزلوں کا لکھنے والا شاید اپنا وہ سارا لطیف دور گزار کر یہاں پہنچا تھا اور میں بہت دیر کے بعد اس کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ملاقات بہت مختصر رہی رات گذار کر وہ سویرے کی گاڑی سے چلے گئے۔

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے بڑے گہرے مراسم ہیں۔ جناب ذاکر حسین جب تک بہار کے گورنر رہے، ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور صالحہ حسین ان لوگوں سے ملنے آجاتی تھیں، آپ جب بھی پٹنہ آئیں ہمیشہ ہم لوگوں سے ملنے ہمارے گھر آتی رہی تھیں۔ سانولی سلونی سی، بڑی ہنس مکھ اور بڑے پیارے انداز میں گفتگو کرنے والی صالحہ بہن انسانیت اور اردو ادب کی خدمت گذار ہیں--- جب تک جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بہار کے گورنر رہے، ہم لوگوں پر بہت کرم فرماتے رہے، لیکن انہیں اپنے گھر بلانے کی ہمت ہمیں نہ ہوئی جب آپ یہاں سے واپس تشریف لے جانے لگے اور حکومت ہند کے نائب صدر مقرر ہو گئے تو ہم لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ انہیں وداعی دعوت دی جائے، براہ نوازآپ نے ہماری دعوت قبول کی اور رات کے کھانے پر تشریف لائے ، بڑا مجمع تھا، ڈاکٹر صاحب قبلہ، دو تین گھنٹے تک ہمارے گھر رہے اور خوش خوش واپس تشریف لے گئے۔

۹رمئی ۱۹۶۳ء کی شام کو مجھے خبر ملی کہ جیلانی بانو اور ان کے شوہر انور معظم پٹنہ آگئے ہیں اور سہیل

عظیم آبادی کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔تھوڑی دیر بعد سہیل صاحب خود ہی آ گئے، کہنے لگے آج سات بجے شام کو بانو آپ لوگوں سے ملنے آ رہی ہیں--- دبلی پتلی بھولی بھالی سی جیلانی بانو کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے ابھی ابھی یہ لڑکی اپنے اسکول سے آ رہی ہے۔ بڑا پیارا خوبصورت چہرہ، متین پُرخلوص اور ذہین آنکھیں، اور سنجیدہ سے لب، رات کی ہلکی سی روشنی میں پہلی بار سفید لباس میں انہیں دیکھ کر بے اختیار مجھے چینی کی گڑیا یاد آ گئی۔ابھی جی بھر کر دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ سہیل صاحب نے جانے کا شور مچایا۔۔اور بس شربت کا ایک گلاس پی کر ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

دوسری صبح کو سہیل صاحب کے گھر میں پہلی بار گئی۔جیلانی بانو نے اپنے شوہر انور معظم سے میرا تعارف کرایا اور پھر ہم لوگ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔انور معظم کو دیکھ کر بھی یہی محسوس ہوا کہ یہ لڑکا یقینی ابھی کسی کا ''شوہر'' نہیں کہلا سکتا ہے، دبلا پتلا، سانولا سا، لمبا قد، ذہین چہرہ اور بہت بلند ارادے، مجھے انور سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ان دونوں میاں بیوی میں جو سب سے اچھی بات تھی وہ یہ کہ تکلف والا پردہ نہیں تھا اور یہی چیز ایسی ہوتی ہے جو مجھے اپنا لیتی ہے، یہ نئے کمسن جوڑے مجھ کو بڑے پیارے لگے۔اسی دن شام کو کانفرنس میں تقریریں تھیں--- اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب اکٹھا ہو بیٹھے تھے۔شام کو اختر صاحب اور رضا نقوی صاحب کے ساتھ کانفرنس میں مجھ کو بھی جانا پڑا--- کچھ تقریریں ہوئیں اور کچھ پیپر پڑھے گئے۔لیکن ان سارے ہنگاموں میں مجھے تسنیم سلیم کا بڑا شدید انتظار رہا، آخر جب کانفرنس ختم ہو چکی اور ہم لوگ گھر آنے کو ہال سے نکل رہے تھے تو سہیل صاحب نے مجھے تسنیم سے ملایا جو دبی دبی مسکراہٹوں کے ساتھ ہال میں داخل ہو رہی تھیں۔۔شام کی چھائی ہوئی شفق کی روشنی میں، میں نے بڑے پیار سے تسنیم کو دیکھا جس کو دیکھنے کی حسرت اس زمانے سے تھی جب تسنیم کا افسانہ ''کسک'' بہت سے دلوں کی ٹیس بن چکا تھا--- پر بہار دنوں میں تسنیم کے جیتے جاگتے افسانوں نے تخیل میں رنگینیاں اور خیالوں میں کیف وخمار بھر دیا تھا--- اور اب ایک جُگ بیت جانے پر ہم ایک دوسرے سے مل رہے تھے، ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔اس کے بعد تسنیم سلیم چھتاری جب بھی پٹنہ آئیں ہمیشہ مجھ سے ملنے آتی رہی ہیں۔

مجھکو اچانک یہ خبر ملی کہ رضیہ سجاد ظہیر پٹنہ آئی ہوئی ہیں اور ہملوگوں سے ملنا چاہتی ہیں، سن کر بے حد خوشی ہوئی اور فوراً اپنی بہن صوفیہ کی کوٹھی سے ان کو فون کیا کہ آپ ضرور تشریف لائیں۔۔۔رضیہ بہن کو جلدی واپس جانا تھا اس وجہ سے میرے فون کے بعد وہ صوفیہ کی کوٹھی پر ہی مجھ سے ملنے کو چلی آئیں۔

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد رضیہ بہن نے مجھے اپنا ناول ''دشمن'' دیا، اور دینے سے پہلے ناول کا پہلا باب خود سنانے لگ گئیں۔ اتنی خوبصورت طرز ادا میں وہ اپنا ناول سنا رہی تھیں کہ ہم سارے کے سارے لوگ ان کی آواز، ان کے الفاظ اور ان کے لب و لہجے میں ڈوب کر رہ گئے --- رضیہ بہن اپنے اسی ناول کے نکاسی کے سلسلے میں تشریف لائی تھیں۔ رضیہ بہن کے جانے کے بعد اب جب بھی ''دشمن'' پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار ان کی آواز کا جادو یاد آ جاتا ہے۔

(تلخیص)

متفرقات

(۱) تقریظ وتعارف

''......اس سلسلے میں اردو افسانہ نگار خواتین نے بھی بڑی مستقل مزاجی اور تسلسل کے ساتھ حقیقت نگاری کی اس روایات کو تاب وتوانائی بخشی ہے۔ سماجی حقیقت نگاری سے اپنی ذات کی پیچیدگیوں کا سرا تلاش کرنے کا کام خواتین افسانہ نگاروں نے بڑی ایمانداری سے کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے کارنامے گراں قدر ہیں اوران کی تخلیقات عالمی ادب کاایک حصہ ہیں......''

بحوالہ،''ڈوبتی شام''از امتیاز فاطمی پیش لفظ شکیلہ اختر

''......افسانوں کوایک نئے انداز سے سجانے سنوارنے کا آرٹ شمیم صادقہ کومعلوم ہے۔ ذہن کی دھیمی دھیمی آنچ پر جب دل کے لہو پگھل پگھل کر آنسو بنتے ہیں اور پلکوں سے ٹپک ٹپک کر بکھرنے لگتے ہیں تب شمیم صادقہ کے افسانے جنم لیتے ہیں......''

بحوالہ،''کرچیاں''از شمیم صادقہ پیش لفظ ،شکیلہ اختر ،صفحہ۔۵

(۲) مکتوبات

الف:- <u>بنام پروفیسر لطف الرحمٰن</u>

پٹنہ

۲/ستمبر ۱۹۶۶ء

عزیز لطف الرحمٰن صاحب السلام علیکم

ابھی ابھی آپ کا محبت سے بھرا ہوا خط اختر صاحب کے نام پڑھا۔ آپ نے اختر صاحب کی ذات سے جس محبت خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا اس سے طبیعت بڑی مسرور ہوئی۔ آپ نے اپنے خط میں میرے متعلق جن شکوک وشبہات کی طرف اشارہ کیا ہے مجھے اس سے بڑی تکلیف پہونچی ہے۔ چوں کہ آپ ہم لوگوں سے بہت قریب رہے ہیں اس لئے میں یہ خط لکھ کر آپ کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہ رہی ہوں اور آپ لوگوں کی طرف سے جو تکلیف مجھے پہونچی ہے اس کا اظہار کر دینا مناسب سمجھتی ہوں، تا کہ آئندہ آپ لوگ اختر صاحب کو ہر ان باتوں سے روکتے رہیں جو ان کی صحت، ان کی زندگی اور ان کی پوزیشن کے خلاف ہو۔

لطف الرحمٰن صاحب میں نے اپنے شوہر سے اتنی محبت کی ہے اور کرتی رہی ہوں کہ بہت کم بیویوں کو یہ مقام نصیب ہو سکا ہوگا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میرا شوہر ایک بیمار انسان ہے جو ہفتے کے سات دنوں میں یقینی طور پر تین دن اپنی کسی نہ کسی بیماری میں گزارتا ہے۔ سینی ٹوریم کے مہربان اور ماہر ڈاکٹر موتھو نے ان کی ساری زندگی کا نقشہ کھینچ کر تاکیدی طور پر یہ بتا دیا تھا کہ انہیں کتنی کم محنت اور کتنا زیادہ آرام کرتے رہنا چاہئے۔

میں اختر اور ینوی کی ۳۳ سال کی رفیق زندگی ہوں ۔ میں نے خدانخواسطہ اپنے شوہر پر چند سیکنڈ کے لئے بھی کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کیا ہے، مگر مجھ کو اس بات کا غم ہے اور بے انتہا غم ہے کہ اختر صاحب نے آج تک اپنا مقام سمجھا ہی نہیں ۔ ایک سینئر پروفیسر جس کی شخصیت کا ڈنکا ہندو پاکستان میں بج رہا ہے وہ ''دو ٹکے والے گھروں'' میں جا جا کر پڑھاتا رہتا ہے، لوگ ہنستے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، گندگی اچھالتے ہیں، مگر افسوس کہ اس کے چہیتے دوست اور جانثار شاگرد ان کی ساری گندگیوں کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اس مجسم ایثار و قربانی کے دیوتا سے یہ کہہ سکیں کہ آپ اپنے مقام سے گر رہے ہیں، آپ کی صحت تباہ ہو رہی ہے اور لوگ آپ پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ خدا کے لئے اپنا مقام دیکھئے اور اپنی شخصیت کو ان دو ٹکے والے گھرانوں پر قربان نہ کیجئے۔ کاش کوئی ایک دوست ہوتا، کاش کوئی ایک بھی ایسا شاگرد ہوتا جو اس گلی کے نکڑ پر تماشا دیکھنے والے بدنیت لوگوں کے درمیان جاتے ہوئے انہیں روکتا۔ کیا آج اختر صاحب کا اپنا بیٹا یہ تماشا دیکھ سکتا تھا؟ مجھ کو ہر ایک ہمدردی کرنے والے سے شکایت ہے کہ اختر صاحب اپنا مقام بھول کر خودغرضوں کے گھروں میں جا جا کر پڑھاتے رہے تھے اور ان کی عزت کا خیال رکھتے ہوئے اپنا آرام ، اپنی صحت اور اپنی زندگی سب کچھ ان پر سے نثار کر رہے تھے تو ان کا ہاتھ روکنے والا اور ان کے قدموں کو تھامنے والا کوئی کیوں نظر نہ آیا؟ سوائے ایک میرے جو میں بیتاب ہوتی رہی، بے چین ہو ہو کر سمجھاتی رہی مگر اختر صاحب نے میری اکیلی آواز کو ایک کمزور حسد کرنے والی تنگ نظر صرف ایک عورت کی آواز سمجھی اور کبھی نہ رکے۔ کاش میری آواز کے ساتھ چند آوازیں اور بھی سنائی دیتیں تو میرے شوہر کے پاک دامن پر آج گندگی کی یہ چند چھینٹیں کبھی نہیں پڑتیں۔ میں اپنے شوہر پر کبھی شک نہیں کر سکتی، مجھ کو تو اپنے شوہر پر بفضلہ ناز ہے۔ مگر آج میرا دل غم سے چور ہے کہ میرے شوہر کو لوگوں نے بیل کی طرح جیتا، لوگوں نے اس کو اس کے مقام سے گرایا۔ اس کو گرتے ہوئے دیکھا مگر کسی نے اس کو خودغرضوں کی خودغرضیوں سے آگاہ نہ کیا۔ میرا دل بے حد غمگین ہے۔ سارا شہر میرے شوہر کا مذاق بنا رہا ہے اور لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔

شکیلہ اختر

معاف کیجئے گا آج زندگی میں پہلی بار اپنے دل کا زخم دکھا رہی ہوں ۔ خدا کے لئے اب بھی آپ لوگ ان کی صحت، ان کی زندگی اور ان کی عزت کا خیال رکھئے ۔ یہ بے حد نیک ہیں ۔ اسی لئے خدائی خدمت گار بن کر اپنے کو برباد کرتے رہے ہیں ۔
شاگرد کا مقام ایک بیٹے کا ہوتا ہے ۔ مگر آہ کسی نے بیمار شوہر کو اس کی خاکساری سے نہ روکا ۔

بدنصیب
شکیلہ اختر

(بحوالہ ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' خطوط بنام لطف الرحمن ، مرتبہ ڈاکٹر شیریں زبان خانم ص ۱۵۶)

ب :- <u>بنام عظیم اقبال</u>

اپنے مختصر مضمون بعنوان ''شکیلہ اختر کے ۱۰۰ برس'' میں عظیم اقبال رقمطراز ہیں ۔
''ان سے طویل مراسلت کا سلسلہ بھی رہا......''
اپنے مراسلے میں مجھے لکھتی ہیں :-
(۱)

''.........کیا تم نے 'ہمایوں' کے پرانے پرچے کبھی نہیں دیکھے ہیں---؟ میں بہت چھوٹی سی تھی ۔ اس وقت اٹک اٹک کر پڑھنا سیکھ رہی تھی ۔ ابا جان اور اماں جان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا ۔ اس وقت کے سارے رسالے زنانہ ، مردانہ بھی آیا کرتے تھے، تو جناب ایک دن میں نے بڑا اچھا چکنے چکنے ورقوں والا رسالہ ہاتھ میں لیا اور اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگی.......''

(نجی خط سے)

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ اپنے ایک مراسلے میں انہوں نے مجھے لکھا تھا :-
(۲)

''........زندگی کے ریگستانوں کو بڑی مشکلوں سے پار کرتی ہوئی موت کے دریا میں

اب پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ پتہ نہیں کس وقت موت کی دھارا اپنی تڑپتی ہوئی موجوں میں بہا کر لے جائے۔

(نجی خط سے)

(۳)

''......میں تو ان کی ساری منور کرنوں کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ بھولے سے بھی کبھی مجھے یہ خیال نہ آیا کہ یہ چمکتا ہوا سورج کبھی غروب بھی ہو سکتا ہے؟ مگر اب میں گھور اندھیرے میں، انجان راہوں میں لڑکھراتی جا رہی ہوں، جہاں اختر صاحب کے کہیں نقشِ قدم نہیں ملتے۔ اب تک وہی پیارے نقشِ قدم ہی تو میرے لئے چراغِ راہ تھے۔ منزلوں تک پہونچانے والے روشن ستارے، پر اب تو کچھ بھی نہ رہا! دل جب بری طرح گھبرانے لگتا ہے تو افسانے لکھنے لگتی ہوں......''

(نجی خط سے)

شکیلہ اختر کے کئی خطوط دیگر ادبی اشخاص کے پاس بھی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام اوراقِ پریشاں کو یکجا کر لیا جائے۔

اقتباسات

از

''بہار کے لوک گیت'' اور ''بہار میں شادی کی رسمیں''

بہار کے لوک گیت میں بھی شکیلہ اختر کی دلچسپی تھی اس موضوع پر ان کے دو طویل مضامین ہیں۔ لوک گیت کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:-

''........لوک گیت سماج کے ہر طبقے اور ہر زاویے کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ پوری زندگی لوک گیت کاروں کے سامنے ہوتی ہے اور اکثر تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کے کس لوک گیت کا فنکار کون ہے؟ پوری زندگی اور سماج دونوں لوک گیتوں میں خون صالح کی طرح رواں دواں ہے۔ پیدائش کے موقعے کے لوک گیت ملتے ہیں تو شادی بیاہ اور دوسرے رسومات کو بھی یہ آئینہ دکھاتے ہیں۔ موسم کی نیرنگیاں بھی ان میں ظاہر ہوتی ہیں، لوک گیتوں سے طنز وظرافت کا کام بھی لیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ اجتماعیت اور ادبیت کی چاشنی ان میں ہوتی ہے۔ ان میں نغمگی کا رس اور سادگی و پرکاری کا امتزاج ملتا ہے۔ عوام کی سادہ زندگی کے لئے لوک گیتوں میں تفریح کا سامان بھی ہوتا ہے........''

FOLK LITERATURE یعنی لوک ادب کا تعلق عوام سے ہے۔ یہ دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادب میں عوام کی دلچسپی کا سامان ہے تفریح اور زندہ دلی کے عناصر ان گیتوں میں پائے جاتے ہیں۔ شکیلہ اختر نے بہار میں گائے جانے والے گیت کی چند قسمیں

پیش کی ہیں اور کافی تفصیل سے ان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ مثالیں بھی دی گئی ہیں اور ان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں، ایک کا عنوان ہے ''بہار میں شادی کی رسمیں'' شائع شدہ رسالہ ''نقوش'' لاہور دسمبر ۱۹۶۱ء دوسرے مضمون کا عنوان ہے ''بہار کے لوک گیت'' از شکیلہ اختر، ''آج کل دہلی'' لوک گیت نمبر، جنوری ۱۹۷۵ء۔

جھومر کے گیت کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:-

بسیا کاہے کو بجائیو، میں تو آئی رہی
بسیا کاہے کو بجائیو، میں تو آئی رہی
بسیا کی آواز اندر کمرے گئی، کھانے کمرے گئی
میں تو راجہ جی کو کھانا کھلاتی رہی
بسیا کاہے کو بجائیو، میں تو آئی رہی

ایک اور مشہور جھومر ہے۔

میں جو ہوتی راجہ، بن کی کوئلیا
کوہک رہتی راجہ تیرے بنگلے میں
نجر لاگی راجہ تیرے بنگلے میں

٭

نوٹ:

بسیا ...... بانسری
نجر ...... نظر

اقتباسات

از

ناولٹ

(۱) :

''.......مسز لال کی کہانی کوئی انوکھی کہانی نہ تھی ، جب لڑکیوں کے دلوں میں تمنائیں جاگنے لگتی ہیں اور زندگی نشہ بن کر آنکھوں میں سما جانا چاہتی ہے اور ایک ہی نقش کو دل میں چھپا کر سب کچھ اس پر سے لٹا دینے کو جی چاہتا ہے، تو اسی طرح مسز لال نے بھی ایک تمنا کی تھی اور اپنے من مندر میں ایک دیوتا کی پوجا کی تھی مگر ان کا سندر سپنا بہت جلدی ٹوٹ گیا اور ایک دن اگنی دیوتا کے آگے پھیرا کرتے سمٹے ، سر جھکائے اس بھدے پیروں پر ان کی نظر پڑی تھی ، وہ ان کے بمل کے پاؤں تھے ۔ ان کا بمل اس وقت سات سمندر پار ان سے بہت دور، شاید آرکسٹرا کے دھن پر کہیں مست ہو رہا تھا اور یہاں شہنائی بج رہی تھی اور پوتر آگ کے پھیرے لگ رہے تھے ۔ پرانی کہانیوں کی طرح بمل نے بھی انگلینڈ جا کر انہیں بھلا دیا تھا اور ڈاکٹر لال کی دلہن بن کر اب انہیں بھی اس کو بھلانا پڑا تھا اور اس طرح سے ایک ہی ساتھ وہ بمل اور اپنے آپ کو بھول چکی تھیں........''

(ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' از شکیلہ اختر)

(۲):

کسی کردار کی داخلی اور خارجی کیفیات کا اظہار مکالمے کے ذریعے ہی ممکن ہے، مکالمے کا فطری اور حسب حال ہونا اچھی کردار نگاری کے لئے ضروری عنصر ہے۔ درج ذیل عبارت میں اس خوبی کو ملاحظہ کیجئے:۔

''.........ارے ڈرتی کیوں ہے پگلی۔ دیکھ تو جلا! تجھ جیسی کتنی عورتیں یہاں آئی ہوئی ہیں، نجبین نے دیدے گھما کر اس طرف کو دیکھا جس طرف رکشا والے نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا تھا کہ یہاں اسپتال میں عورتوں کی بھرتی ہوا کرتی ہے۔ نجبین مورت بنی گم سم کھڑی تھی اور اسلم خاں کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ ہلدی کی طرح پیلے پیلے ہاتھ کو اسلم خاں نے تھام کر کہا'' چل میں تجھے خود سے ڈاکٹروں کو دکھا دوں۔ تھوڑی سی ہمت تو تجھے کرنی ہی پڑے گی، اپنا آپ تو تجھی کو سنبھالنا ہوگا، میں کب تک تیری پٹی سے لگ کر بیٹھا رہوں گا دو چار پیسوں کی فکر بھی تو کرنا ہی ہوگی، آخر تجھے کب تک دوسرے کے دروازے پر چھوڑ دوں گا ....؟''

(ناولٹ ''سرحدیں'' از شکیلہ اختر)

(۳):

ناولٹ ''منزل'' کے یہ چند سطور نظر نواز ہوں جہاں شکیلہ اختر نے جنگ کے یہ مناظر دکھائے ہیں:۔

''......اتحادی فوج فتح کا ترانہ گاتی ایک سیلاب کی طرح آگے سے آگے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی، چھوٹے چھوٹے اٹالین دستے بڑی بزدلی سے شکست کھاتے ہوئے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ آخر فوجی بینڈ فتح و مسرت کا ترانہ گاتا ہوا اسمارہ کے قلعے کی طرف بڑھتا گیا۔ گھمسان (جنگ) کے مقابلے کے بعد کاؤنٹ کا قلعہ جیت لیا گیا۔ اس روز ساری فوج نے بڑے جوش سے خوشی کا دن منایا تھا اور اسی رات کو زاہدی نے بڑے سکون کے ساتھ عینی کو لکھا تھا......''

(ماخوذ از ناولٹ ''منزل'' مصنفہ شکیلہ اختر)

دوسری جنگ عظیم (۱۹۲۹ء) میں اٹالوی فوج کی ہار ہوئی تھی اور اتحادی فوج نے فتح حاصل کر کے کاؤنٹ کے قلعے پر اپنا پرچم لہرایا تھا۔ ماضی کا یہ تاریخی منظر شکیلہ اختر کے قلم نے اس طرح کھینچا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آنکھوں دیکھا منظر ہے۔

شکیلہ اختر کے اندازِ بیان میں کمالِ ہنر مندی کا یہ انداز اکثر مقام پر قارئین کو حیران کر دیتا ہے۔ جنگ کے ماحول کی عکاسی ہو یا گھر آنگن کی تصویر کشی، اسپتال کا منظر ہو یا دور دراز کے قصباتی علاقے کی فضا آفرینی، وہ ایک کامیاب قلم کار کی طرح اپنی شناخت کراتی ہیں۔

کتب و رسائل

	نام مصنف	نام کتاب	مقام اشاعت	سال
۱	شکیلہ اختر	''درپن'' طبع زاد افسانوی مجموعہ	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۳۷ء
۲	شکیلہ اختر	''آنکھ مچولی'' طبع زاد افسانوی مجموعہ	قادری پریس، نور منزل، ممبئی ۳	۱۹۴۰ء
۳	شکیلہ اختر	''ڈائن'' طبع زاد، افسانوی مجموعہ	مکتبہ دین و دانش، رمنہ روڈ، پٹنہ	۱۹۵۲ء
۴	شکیلہ اختر	''آگ اور پتھر'' طبع زاد، افسانوی مجموعہ	رام نرائن بینی پرساد، الہ آباد	۱۹۶۷ء
۵	شکیلہ اختر	''لہو کے مول''، طبع زاد، افسانوی مجموعہ	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۴	۱۹۷۶ء
۶	شکیلہ اختر	''آخری سلام''، طبع زاد افسانوی مجموعہ	نامی پریس لکھنو	۱۹۸۶ء
۷	شکیلہ اختر	''تنکے کا سہارا''، طبع زاد (ناولٹ)	نصرت پبلیشرز، لکھنو	۱۹۷۵ء
۸	مرتب قمر اعظم ہاشمی	''ساغر نو'' (اختر اورینوی نمبر)	مکتبہ ادب، روڈ نمبر ۵ گردنی باغ، پٹنہ	
۹	پروفیسر وہاب اشرفی	بہار میں اردو افسانہ نگاری (تنقید)	بہار اردو اکاڈمی پٹنہ	۱۹۸۹ء
۱۰	وارث علوی	جدید افسانہ اور اس کے مسائل (تنقید)	نئی آواز جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۹۰ء

۱۱:	وقار عظیم	فن افسانہ نگاری (تنقید)	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۰ء
۱۲:	پروفیسر عبدالمغنی	اختر اورینوی کے افسانے (تنقید)	بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ	۱۹۷۷ء
۱۳:	پروفیسر قمر رئیس	ترقی پسند ادب کے معمار (تنقید)	ایچ ایس پرنٹرس، نئی دہلی	۲۰۰۶ء
۱۴:	پروفیسر گوپی چند نارنگ	اردو افسانہ: روایت ومسائل (تنقید)	عفیف پرنٹرس، دہلی	۲۰۰۰ء
۱۵:	پروفیسر گوپی چند نارنگ	بیسویں صدی میں اردو ادب (تنقید)	ساہتیہ اکاڈمی، دہلی	۲۰۰۲ء
۱۶:	شہزاد منظر	جدید اردو افسانہ (تنقید)	عاکف بک ڈپو، مٹیا محل، دہلی	۱۹۸۸ء
۱۷:	ارتضیٰ کریم	اردو فکشن کی تنقید	دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۹۶ء
۱۸:	ممتاز شیریں	منٹو نوری نہ ناری (تنقید)	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
۱۹:	انور سدید	اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش (تنقید)	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۲۰:	ش-اختر	شناخت (تنقید)	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۲۱:	احمد یوسف	"لہو کے مول-ایک مطالعہ (تنقید)	مکتبۂ جامعہ نئی دہلی	۱۹۸۷ء
۲۲:	شکیلہ اختر	اردو افسانہ کل، آج، کل (سمپوزیم)	رسالہ کتاب لکھنو	۱۹۷۰ء
۲۳:	شاہد لطیف	پوم پوم ڈارلنگ، عصمت پر مضمون	نقوش کراچی شمارہ ۸	۱۹۴۹ء
۲۴:	رسالہ شاعر (آگرہ)	افسانہ نمبر	اکتوبر نومبر	۱۹۴۵ء

۲۵:	رسالہ نقوش	شخصیات نمبر	لاہور، مدیر محمد طفیل	۱۹۵۶ء
۲۶:	رسالہ آج کل دہلی	مضمون شکیلہ اختر فن اور شخصیت از عظیم اقبال	ستمبر	۱۹۹۴ء
۲۷:	مضمون ذکر لطیف	از افسانہ نگار خاتون کے قلم سے	رسالہ شاعر آگرہ، اکتوبر نومبر	۱۹۴۵ء
۲۸:	شکیلہ اختر	مضمون، بہار کے لوک گیت	رسالہ آجکل (لوک گیت نمبر) جنوری	۱۹۷۵ء
۲۹:	ڈاکٹر احمد صغیر	بہار میں ادو فکشن	(تنقید)	۲۰۱۴ء
۳۰:	پروفیسر علیم اللہ حالی	فردوفن (تنقید)	نائس کمپیوٹر پریس پٹنہ	۲۰۰۵ء
۳۱:	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	اردو ناول کے اسالیب (تنقید)	تخلیق کار پبلیشرز دہلی	۲۰۰۶ء
۳۲:	ڈاکٹر خورشید سمیع	جدید تنقید ایک جائزہ (تنقید)	ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہاؤس	۲۰۱۰ء
۳۳:	مدیر نوشاد مومن	بہار کا معاصر ادب نمبر مژگان	سہ ماہی کلکتہ، vol 17,18, Jan2017,to Dec2017)	
۳۴:	پروفیسر قمر جہاں	بہار کی خواتین افسانہ نگار	آغاز تا حال، طویل مضمون، ایضاً	
۳۵:	کہکشاں پروین	شیشہء افکار (تنقید)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۱۴ء
۳۶:	امتیاز احمد کریمی	مشاہیر دبستان بہار	اردو ڈائریکٹوریٹ، حکومت بہار پٹنہ	۲۰۲۰ء

۳۷: ڈاکٹر اسلم جاوداں — بہار کا اردو ادب آزادی کے بعد — تاج آفیسٹ پریس، پٹنہ — ۲۰۲۰ء

۳۸: ڈاکٹر قیام نیر — بہار میں اردو افسانہ نگاری (تنقید و تحقیق) — آزاد پریس، سبزی باغ پٹنہ — ۱۹۹۵ء

۳۹: ڈاکٹر زرنگار یاسمین — نئے پرانے افسانے: متن اور تجزیے (تنقید) — ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۱۸ء

۴۰: فاروق اعظم قاسمی — تخلیق کی دہلیز پر (تنقید) — ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۱۳ء

۴۱: ڈاکٹر محسن رضا رضوی — بہار میں اردو نثر بڑھتے قدم (تنقید) — عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی — ۲۰۲۰ء

۴۲: مرتب منصور خوشتر — اردو ناول کی پیش رفت (تنقید) — ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۱۷ء

۴۳: ڈاکٹر مجاہد اسلام — شکیلہ اختر شخصیت اور فن — ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۱۳ء

۴۴ ڈاکٹر حامد علی — جادۂ تفہیم (تنقید) — ایجوکیشنل پلیشنگ ہاؤس، دہلی'' — ۲۰۱۲ء

۴۵: ڈاکٹر خالدہ ناز — درسیات (تنقید) — ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی'' — ۲۰۲۱ء

ختم شد

Monograph-25
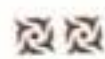
Shakeela Akhtar

By : *Prof. Quamar Jahan*

بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر ایک معتبر اور اہم نام ہے۔ انہیں جو شہرت اور مقبولیت ملی وہ کم خواتین افسانہ نگاروں کو ملی۔ انہیں بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ان کا اصل نام شکیلہ توحید ہے۔ ان کے والد کا نام محمد توحید ہے۔ ان کی ولادت ارول (موجودہ ضلع جہان آباد) میں ہوئی۔ وہ ملازمت پیشہ خاتون تھیں اور نہ ہی کسی اسکول یا کالج کی سند یافتہ۔ مگر وہ یکدم سے گھریلو خاتون بھی نہیں تھیں بلکہ ایک باشعور اور باوقار خاتون تھیں۔ کسی کالج یا اسکول میں تعلیم حاصل کئے بغیر جس طرح کے معیاری اور اعلیٰ قدر افسانے لکھے وہ ان کی فنکارانہ عظمت کی دلیل ہے۔

شکیلہ اختر کا تخلیقی سفر 1936ء سے 1986ء کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔ اس درمیان شکیلہ اختر کے چھ افسانوی مجموعے اور ایک ناولٹ منظر عام پر آئے۔ (۱) درپن، مکتبہ اردو، لاہور 1937ء (۲) آنکھ مچولی، دانش کدہ، بمبئی 1940ء (۳) ڈائن، مکتبہ ادب، رمنہ روڈ، پٹنہ 1952ء (۴) آگ اور پتھر، رام نرائن لعل بینی پرساد، کٹرہ الہ آباد 1967ء (۵) لہو کے مول، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 1976ء (۶) آخری سلام، نامی پریس، لکھنؤ 1986ء اور ''تنکے کا سہارا'' (ناولٹ)، نصرت پبلشر، لکھنؤ 1975ء۔

شکیلہ اختر ایک اعلیٰ خانوادے سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے افسانوں میں عام کمزور لوگوں، دلت اور آدی واسی طبقے کی زندگی کی تصویر کشی، ان کے مسائل اور درد کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے حاشیہ پر رہنے والے انسانوں اور محروم طبقات سے اپنا خاص رشتہ رکھا ہے اور ان کو موضوع بنا کر انسانیت کی تلاش کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقت نگاری اور ان کی ذات کا کرب پوشیدہ ہے جو دوسروں کے یہاں شاذ و نادر ہے۔ ان کے افسانے معیاری، اعلیٰ قدر اور اتنے بلند پایہ ہوتے تھے کہ ہند و پاک کے مقتدر رسائل انہیں فخر کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ شکیلہ اختر کے افسانوں کا بنیادی موضوع عورتوں کے مسائل اور ان کی زندگی کا کرب و درد ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی ناآسودگی کی تصویر بڑی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ پیش کی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی کرب کو ہمہ گیر اور آفاقی بنا دیا ہے۔ وہ آج بھی خواتین افسانہ نگاروں کے لئے مشعل راہ ہیں۔

یہ فرد نامہ پروفیسر قمر جہاں نے لکھا ہے۔ وہ درس و تدریس، افسانہ نگاری اور تنقید و تبصرہ نگاری میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ مختلف موضوعات پر لکھتی رہتی ہیں۔ ان کے ادبی اور معلوماتی مضامین ریاست اور بیرون ریاست کے معیاری اور مشہور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نیشنل اور انٹرنیشنل سیمینار اور ورک شاپ میں شرکت کرتی رہتی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چارہ گر'' 1983ء میں منظر عام پر آیا۔ معیار (مضامین) 1987ء، اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری 1987ء، اجنبی چہرے (افسانے) اور پنجرے کا قیدی (افسانے) 2015ء وغیرہ ان کی اہم اور قابل قدر تصانیف ہیں۔ شکیلہ اختر سے ان کی ملاقات رہی ہے اور ان پر مضامین لکھتی رہی ہیں۔ اس اعتبار سے شکیلہ اختر پر ان کا رقم کیا ہوا یہ فرد نامہ شکیلہ شناسی کے باب میں ایک کامیاب پیش کش ہے۔

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना